جلد ۵ شمارہ ٦

دو ماہی

الفاظ

نومبر، دسمبر ۱۹۸۰ء

زر سالانہ ـــــ دس روپے
فی کاپی ـــــ دو روپے

پرنٹر و پبلشر ـــــ اسد یار خاں
مطبوعہ ـــ اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد
کتابت ـــ ز۔ رشید، الٰہ آباد

مقام اشاعت
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

سرورق پر: راجندر سنگھ بیدی

پتہ: دو ماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
فون نمبر ۳۷۹۸

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

آئینہ

ایک افسانہ نگار

مضامین

افسانے

طنز و مزاح

منظومات

پروفیسر آل احمد سرور
ڈائرکٹر آف اقبال انسٹی ٹیوٹ
یونیورسٹی آف کشمیر، سری نگر ۱۹۰۰۰۶

بیدی کے افسانے ـــ ایک تاثر

"ہاتھ ہمارے قلم ہوئے" میں ایک اعتراف کے عنوان سے بیدی لکھتے ہیں:۔

"پہلے میں بہت بے ضرر قسم کی کہانیاں لکھا کرتا تھا، قادر۔ جن کا تعلق سطح محض سطح سے تھا اب جب کہ میں نے انسان کے تحت الشعور میں جانے کی کوشش کی ہے تو پہلے ہی نقادوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ تم جنس پہ لکھنے لگے ہو۔ میں جنس پر لکھتا بھی ہوں، باپ روزار یو! تو ایک ذمہ داری کے احساس کے ساتھ۔ ایسے ہی ارتعاش پیدا کرنے یا مرتعش ہونے کے لئے نہیں"

بیدی نے اپنی جن ابتدائی کہانیوں کو بے ضرر کہا ہے، جن کا تعلق ان کے نزدیک محض سطح سے تھا وہ بے ضرر تو کہی جا سکتی ہیں مگر سطحی ہرگز نہیں۔ ان کے پہلے مجموعے "دانہ و دام" میں دو کہانیاں ایسی ہیں جو انھیں اپنے اہم عصروں سے ممتاز کرتی ہیں اور جن میں کہانی شعر بن گئی ہے۔ یہ ہیں "بھولا" اور "گرم کوٹ"۔ بھولا ایک بیوہ کا بچہ ہے جو اپنے دادا سے کہانیاں سنتا ہے اور اپنے ماموں کے آنے کا انتظار کرتا ہے۔ بیدی نے جب کہانیاں لکھنی شروع کیں تو پریم چند اور ترقی پسند تحریک کے اثر سے سماجی موضوعات بہت مقبول تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں بھی رومانیت، جذباتیت اور خطابت تھی۔ بیدی کی کہانیاں رومانی ہونے کے بجائے حقیقت پسندانہ، جذباتی ہونے کے بجائے ایک گہری سوچ کی آئینہ دار اور خطیبانہ ہونے کے بجائے ایک لطیف طنز کی حامل تھیں۔ ان دنوں افسانے کی اپنی زبان کا احساس عام نہ تھا۔ افسانگار کی "گل افشانیِ گفتار" ہی لوگ دیکھتے تھے۔ چنانچہ بیدی کی زبان بڑی اکھڑی اکھڑی، ناہموار، کہیں کہیں بے جا فارسیت لئے ہوئے اور زیادہ تر پنجابی اردو کہی جاتی تھی۔ حالانکہ ان میں زندگی کی ان سچائیوں پر ایک گہری اور سنجیدہ نظر تھی، جن کو یا تو لوگوں نے قابلِ توجہ نہ سمجھا تھا یا ان کی تاب نہ لا سکتے تھے۔

بیدی شروع سے ایک باشعور فن کار دکھائی دیتے ہیں۔ تبھی تو بچوں کے جذبات اور بوڑھوں کی نفسیات پر ان کی نظر گہری ہے۔ پہلے عورت ہمارے افسانوں میں ایک محبوبہ کے روپ میں ہی نظر آتی تھی۔ پریم چند کے افسانوں میں ماں، بیٹی، بہن، کے روپ میں بھی دکھائی دی، مگر یہ عورت، عورت کم ہے، ایثار

اور وفا کی پتلی زیادہ۔ اس کے گرد ایک مقدس ہالہ ہے۔ بیدی کے یہاں عورت کے گرد کوئی ہالہ نہیں ہے۔ بھولا کی بیوہ ماں، مقدس ہی نہیں دل کش بھی ہے۔ گرم کوٹ کے ہیرو کلرک کی بیوی، میاں کی محبت میں سرشار ہے۔ مگر اس کا عورت پن صاف جھلکا پڑتا ہے۔

افسانہ نگار اپنی دنیا کا خدا ہوتا ہے، جو ہر جگہ ہوتا ہے مگر نظر نہیں آتا۔ مگر بیدی اپنے ہر افسانے میں نظر آتے ہیں۔ برنارڈ شا کی طرح نہیں جو تقریر پر تقریر کرتا رہتا ہے، بلکہ چھوٹے چھوٹے دھماکوں میں، جن میں کہیں کوئی لطیف تبصرہ ہے، کہیں کوئی بلیغ فقرہ۔ کوئی اور ہوتا تو افسانہ نگار کا یہ آسیب کی طرح سر پر سوار رہنا کھل جاتا، مگر بیدی سر پر سوار نہیں ہوتے، ہاں سائے کی طرح ساتھ رہتے ہیں۔

بیدی نے ایک عرصے تک ڈاک خانے میں ملازمت کی ہے۔ اس تجربے نے ان سے ایک پنشن یافتہ پوسٹ ماسٹر کے متعلق بڑی جاندار کہانی لکھوائی۔ ملازمت نے اسے ایک ڈھرے پر ڈال دیا تھا۔ سبکدوش ہونے کے بعد اس کی زندگی اتنی خالی ہو جاتی ہے کہ وہ بار بار ڈاک خانے میں ملازمت کرلیتا ہے اور جب بڑھاپے کی وجہ سے اس پر کھانسی کا دورہ پڑتا ہے تو آنے والے اس پر ترس کھا کر کہتے ہیں کہ آخر سرکار اس بوڑھے کو پنشن کیوں نہیں دے دیتی۔ یہی نکتہ انسان کے حالات پر ایک لطیف طنز ہے۔

'دانہ و دام' کی کہانیوں میں زندگی کی وہ سچائیاں ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں جن کے پیچھے نفسیاتی حقائق ہیں: بچوں کی نفسیات۔ بوڑھوں کی نفسیات۔ اس چڑچڑے چمار کی نفسیات جو بیوی سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اس کے انتظار میں بے چین رہتا ہے اور جب وہ آتی ہے تو اسی وجہ سے اس کا کیریکٹر میں کسی مرد سے ٹکرا جانا بھی گوارا نہیں کرتا، اسپتال کے مریضوں کی نفسیات پر بھی بیدی کی گہری نظر ہے جہاں موت کا زندگی پر سایہ ہے مگر زندگی ایک ضدی بچے کی طرح مچلتی رہتی ہے۔ بیدی کے کردار کئی ابعاد رکھتے ہیں۔ بیدی کا ایک حزیں مسکراہٹ، ایک دردمند دل کے ساتھ، ہمیں ایک ایسے نگار خانے کی سیر کراتے ہیں جس میں عام آدمی ان خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر ہیں، جن پر ہماری نظر نہیں گئی تھی۔

'گرہن' سے بیدی کے یہاں ایک اور موڑ شروع ہوتا ہے اور جنس کی نفسیات اپنا سر اٹھاتی ہے۔ بیدی کو تعمیر کا فن آتا ہے اور کفایت شعاری بھی۔ وہ کم سے کم نقوش میں زیادہ سے زیادہ رنگ بھرتے ہیں اور ایک ایک اینٹ رکھ کر عمارت تیار کرتے ہیں۔ حمل کے دوران ساس کی بندشیں، اور میاں کی ہوس ناکی، گرہن کی ہیروئن کو میکے اور اس کی آسائش کے لئے اس طرح بے قرار کرتے ہیں کہ وہ گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہے اور اس موٹر لانچ میں سوار ہو جاتی ہے جو اس کے میکے جا رہی ہے مگر اس کی بستی کا ہی ایک آدمی اس کو اکیلا پاکر اس کی عصمت پر حملہ کرتا ہے اور وہ عین اس وقت جب چاند گرہن ہو رہا ہے سمندر کی طرف ڈوبنے کے لئے

بھاگتی ہے۔ نفسیاتی حقایق کے ساتھ بیدی اساطیری اور دیومالائی پس منظر سے بھی کام لینا جانتے ہیں۔ جبھی تو ان کے کرداروں کا یہ تجربہ زندگی کا ایک قیمتی تجربہ بن جاتا ہے۔

ملک کی تقسیم اور فسادات کے المیے نے اردو کے فنکاروں کو بری طرح جھنجوڑا۔ قدرتی طور پر بیشتر افسانہ نگاروں اور شاعروں کے یہاں ان اندوہ ناک واقعات پر جس میں انسانیت بری طرح سے پامال ہوئی، غم و غصے کا اظہار ہے، یا پھر ان کے سہارے ذہنی اور نفسیاتی، سیاسی اور تاریخی محرکات پر وعظ و پند ہے۔ کم لوگوں نے جذبے کی تطہیر کر کے، اس انسانی المیے کو اس طرح پیش کیا ہے کہ آنسو خشک ہو جائیں اور طغیانی نہ جائے جذبات ہی برانگیختہ نہ ہوں بلکہ ذہن بھی بیدار ہو جائے۔ بیدی کی کہانی لاجونتی ان کے مجموعے "اپنے دکھ مجھے دے دو" کا پہلا افسانہ ہے، اگرچہ فسادات کے بعد کے مغویہ عورتوں کی بازآفرینی کے مسئلے سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر فسادات پر سارے ادب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ میرے نزدیک شعر میں فیض کی نظم "یہ داغ داغ اجالا" مخدوم کی نظم "چاند تاروں کا بن" اور نثر میں بیدی کا افسانہ "لاجونتی" اور عصمت کا افسانہ "جڑیں" جس فنی بصیرت کے ساتھ، کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہہ دیتے ہیں، وہ خاصے کی چیز ہے۔ "لاجونتی" میں ایک المیے کے بعد دوسرا المیہ اپنی ساری گہرائی اور تاثیر کے ساتھ ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ لاجو جو عورت تھی مگر سندر لال نے اسے اپنی نیکی اور رحم دلی کی وجہ سے دیوی بنا لیا۔ جو "بس گئی پر اجڑ گئی"۔ بیدی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ روح کا ملاپ کافی نہیں جسم کا ملاپ بھی ضروری ہے اور جسم کا ملاپ صرف جسمانی سطح پر نہیں ہوتا، روحانی سطح پر بھی ہوتا ہے۔

"اپنے دکھ مجھے دے دو" ایک اور اہم کہانی ہے، میں نے جب یہ کہانی پہلی دفعہ پڑھی تھی تو بیدی کو لکھا تھا، "اردو کہانی پٹری سے اتر گئی تھی، تم نے اسے پھر پٹری پر لا کھڑا کر دیا۔" میرا مطلب یہ تھا کہ کہانی درس یا وعظ ہوتی جا رہی تھی، یا پھر زندگی کے بنیادی مسائل کو چھوڑ کر جزوی یا فروعی مسائل سے ہی چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی اس دور میں منٹو اور عصمت اور کرشن چندر جیسے فنکار لکھ رہے تھے۔ منٹو اور عصمت نے پلہ ایک طرف زیادہ جھکا دیا تھا۔ کرشن چندر نے دوسری طرف۔ کرشن چندر کی رومانیت اور منٹو اور عصمت کی مخصوص حقیقت پسندی کی وجہ سے لوگ روزمرہ زندگی کے رنگا رنگ حقایق، میاں بیوی کے میاں بیوی بننے، دو دلوں اور جسموں کے ملنے اور جدا ہونے اور پھر ملنے اور زندگی کی بھٹی میں تپ کر کندن ہونے کی داستان کو بھول گئے تھے۔ بیدی کی اندو ایک عظیم عورت ہے۔ یوں بھی بیدی نے عورت کو اس کے ہر رنگ ہر روپ، جلال جمال، شفقت محبت طاقت، کمزوری، مظلومیت اور پامالی اور سبزے کی طرح ہر پامالی کے بعد نئے انداز سے سر اٹھانے کی کیفیت دیکھی ہے۔ اندو کہتی ہے۔ "اب تو میرے پاس کچھ نہیں رہا۔" اس کے متعلق مدن، اس کا شوہر کہتا ہے۔ "یہ

ان پڑھ عورت، کوئی رٹا ہوا فقرہ نہیں تو، یہ تو ابھی سامنے زندگی کی بھٹی سے نکلا ہے ابھی تو اس پر برابر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں اور آتشیں برادہ چاروں طرف اڑ رہا ہے"۔

بیدی کے افسانوں کے تازہ ترین مجموعے "ہاتھ ہمارے قلم ہوئے" میں ایک افسانہ ہے جو مجھے تو اردو میں کہیں اور نہیں ملا۔ یہ ہے کتاب کا پہلا افسانہ: "صرف ایک سگریٹ"۔ بیدی کے اکثر افسانے کسی نہ کسی ذاتی تجربے، کسی شخصی واردات کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں لیکن جیسا کہ انھوں نے ایک اعتراف میں کہا ہے وہ جھوٹ سچ سے کام لیتے ہیں، کھرے کھرے سچ سے نہیں۔ "بل" اور "ڈ ینس سے پرے" کے کھرے سچ واقعات ہیں افسانے نہیں ہیں، کیوں نہیں، یہ ایک اعتراف پڑھ کر واضح ہو جائے گا۔ بہرحال اندو اور لاجونتی اور "ایک چادر میلی سی" کی رانو کے علاوہ، بیدی نے ایک اور غیر فانی کردار ہمیں دیا ہے اور وہ ہے سنت رام کا۔

بیدی کے یہاں جنس کا تذکرہ تو بہت کیا گیا ہے مگر لوگ یہ بات بھول گئے کہ ان کی بہترین کہانیاں گھریلو زندگی کے گرد گھومتی ہیں۔ سنت رام بوڑھا ہو گیا ہے، مگر بڑھاپے میں بقول ذاکر صاحب بری عادتیں جوان ہو جاتی ہیں۔ سنت رام اپنے بیٹے سے محبت کرتا ہے اور اس کی جوابی محبت کا بھوکا ہے۔ بیوی اس کے لئے اب "دھوبن" ہو گئی ہے۔ بڑھاپے میں آدمی زیادہ حساس ہو جاتا ہے۔ ہر بات بہت بڑھ چڑھ کر، بہت پھیل کر، بہت گمبھیر ہو کر سامنے آتی ہے۔ دل شیشے سے زیادہ نازک ہو جاتا ہے۔ "سنت رام نے زندگی میں صرف دینا سیکھا تھا اور اب یہ اس کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ جب دیتا تھا تو جیتا تھا۔ لینے میں اس کی روحانی موت واقع ہو جاتی تھی۔" سنت رام کے علاوہ دھوبن کی کردار نگاری بھی بڑی روشن ہے، بیٹے پر بس نہیں چلتا تو میاں سے لڑتی ہے اور کہتی ہے اس گھر میں آ کر اس نے کبھی کوئی سکھ ہی نہیں دیکھا..... پہلے یتیم بھائی بہنوں کے سلسلے میں مجھے ڈانٹتے لڑتے جھگڑتے رہے میرے ساتھ، پھر دوست مجھ پر لاد دیئے۔ ایک ہاتھ سے بچہ کھلا رہی ہوں اور دوسرے سے روٹیاں پکا رہی ہوں ان حرکٹوں کے لئے۔ اب تمہاری اولاد کے حوالے کر دیا..... بیٹے کی یہ ہمت کہ وہ تمھارے ہوتے سوتے مجھے آنکھیں دکھائے"۔

بیدی کہانی لکھتے میں نہ سیاست بگھارتے ہیں نہ فلسفہ چھانٹتے ہیں نہ شاعری کرتے ہیں، نہ موری کے کیڑے گنتے ہیں عام زندگی، عام لوگ، عام رشتے، ان کے افسانوں کے موضوع ہیں مگر ان میں وہ ایسی طاقت اور توانائی۔ زندگی اور تابندگی، معنویت اور انفرادیت بھر دیتے ہیں کہ ذہن میں روشنی ہو جاتی ہے۔ ان کے یہاں اسطور سازی اور جنس کی واقعی اہمیت ہے مگر اس سے زیادہ اہمیت زندگی کے وژن (VISION) کی ہے۔

بیدی نے حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کی کوشش کی ہے اور یہ بات بھی ہے کہ وہ اس حقیقت کو بیان کرتے وقت سماجی ذمہ داری کو یکسر فراموش نہیں کرتے۔ بیدی نے اردو افسانے کو پورا آدمی دیا ہے، جو بہت پست اور بہت بلند ہے لیکن جس کا علم اس لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنی آدمیت اور انسانیت دونوں کا عرفان حاصل کر سکے۔ ☐

اوپیندر ناتھ اشک
۵۔ خسرو باغ، الہ آباد

راجندر سنگھ بیدی ــــ ایک افسانہ نگار، ایک انسان

بیدی کا نام میرے نزدیک "محبوب" کے نام سے بھی عزیز اور اس کے ساتھ گذارے گئے لمحوں کی یاد محبوب کی قربت میں بتائے گئے وقت کی یاد سے بھی عزیز تر ہے۔ اس کے ساتھ اپنی تقریباً پینتیس۔ چالیس برس کی دوستی میں کہیں بھی تلخی دکھائی نہیں دیتی۔ ان برسوں کی یاد میں بھی جب اس میں اور مجھ میں کشیدگی پیدا ہو گئی تھی اور ہم دونوں نے خط و کتابت تک بند کر دی تھی۔ لیکن کوئی تو ایسا غیر شعوری اعتماد ہوگا ہی کہ میری بیوی میرے کسی ایسے عزیز کی سفارش ستونت (بیدی کی رفیقۂ حیات) سے کر سکی جو فلمی دنیا میں جانا چاہتا تھا اور میرے پاس اس غرض سے آیا تھا کہ میں بیدی کے نام کوئی سفارشی خط دے دوں مجھے یاد ہے میں نے کہا تھا میں بیدی کو کبھی خط نہیں لکھوں گا، اور جب اس نے بہت زور دیا تھا تو میں نے کہا تھا کہ وہ کوشلیا سے خط لے لے اس کا کام ہو جائے گا۔

رنجش کے انھیں دنوں میں ستونت سے بمبئی میں ملا تو اسے اُداس دیکھ کر بچوں سمیت اپنے پاس پنج گنی لے گیا۔ جہاں وہ ڈیڑھ مہینے تک رہی اور 'میں تمھیں کبھی خط نہ لکھتا، اگر........' سے شروع کر کے میں نے نہایت سخت چٹھی بیدی کو لکھی جو اس زمانے میں ریڈیو کشمیر کا اسٹیشن ڈائرکٹر تھا کہ وہ میرا خط دیکھتے ہی کشمیر کی بلندیوں سے اترے اور اپنے بیوی بچوں کو سری نگر لے جائے کیوں کہ وہ بمبئی میں پریشان ہیں اور میں اس کی اجازت لیے بغیر انھیں اپنے پاس پنج گنی لے آیا ہوں۔ اور میرا خط پاتے ہی بیدی نے تار دیا تھا "ستونت کو بمبئی بھیج دو۔ میں ہوائی جہاز سے آرہا ہوں۔"

اعتماد کا یہ تار کیا ہے جو بظاہر دکھائی نہ دینے پر بھی دلوں کو باندھے رکھتا ہے!

اس جذبے کو الفاظ میں بیان کر پانا کتنا مشکل ہے ایک دوست جو بیسوں گھنٹے ہمیں گھیرے رہتا ہے دسیوں طریقوں سے اپنی دوستی کا یقین دلاتا ہے۔ بیسیوں کام کر دیتا ہے۔ کرا لیتا ہے عام طور پر ہم اسے دوست کے نام سے یاد بھی کرتے ہیں۔ لوگ بھی اسے ہمارا دوست مانتے ہیں لیکن دل ہے کہ اس جذبے سے ان چھوا ہی رہ جاتا ہے پھر ایسا بھی دوست ہے جو ہماری سخت مخالفت کرتا ہے

مہینوں ۔ برسوں نہیں بولتا۔ لیکن وہ تار نہ جانے کیسے ، نہ جانے کیوں اٹوٹ بنا رہتا ہے ۔ ذرا سی شکن کبھی اس میں نہیں آتی۔ میرے لیے اس فنامنا (PHENOMENON) کو سمجھ پانا نہایت مشکل ہے اسی سلسلے میں مجھے اپنی تیسری شادی کے ایک واقعہ کی یاد آتی ہے ۔ میں دوسری شادی کر چکا ہوں، لیکن ایک ہی مہینے میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے ۔ مجھے اس بات کا پکا یقین ہو جاتا ہے کہ میں اپنی دوسری بیوی سے چلا نہ پاؤں گا۔اپنے خاندان اور معاشرے کے دباؤں میں ویسا کروں گا تو جو غلطی میں کر چکا ہوں اسے دگنا تگنا کرتا چلا جاؤں گا۔ اور میں فیصلہ کرتا ہوں کہ اگر کوشلیا مان جائے (کہ میں اس سے پہلے شادی کرنا چاہتا تھا) تو میں اس سے رشتہ استوار کر لوں گا۔کوشلیا کو مجھ پر یقین نہیں وہ لکھتی ہے کہ پہلے آپ اپنا من پکا کریں۔ لیکن من ہے کہ پکا ہونے میں نہیں آتا فیصلہ کرنا مشکل نہیں ۔ اس پر ڈٹے رہنا مشکل ہے جب کہ اس فیصلہ سے ایک تیسری زندگی کی تباہی کا بھی احتمال ہو میں بیدی کو لکھتا ہوں کہ کوشلیا لاہور آرہی ہے ۔ وہ اس سے ملے ۔ میں نے اسے کچھ کام سونپے ہیں وہ اس کے ساتھ جاکر وہ سب کر دیتا ہے ، لیکن جب وہ میرے پاس دلی جانے کی بات کرتی ہے تو صاف الفاظ میں اسے سمجھا دیتا ہے کہ نہ بیدی دوسری شادی کر سکتا ہے نہ اشک تیسری اور کوشلیا دلی جانے کا ارادہ ترک کر دے ۔ لیکن اشک تیسری شادی کر لیتا ہے ۔ کیوں کہ بیدی کے سمجھانے باوجود کوشلیا اپنا ارادہ ترک نہیں کرتی اور دلی آجاتی ہے ۔ اور میری ڈھل مُل یقینی کو عبور کر میری زوجیت میں چلی آتی ہے تبھی بیدی کا ایک سخت خط ملتا ہے (اسے معلوم نہیں کہ ہماری شادی بھی ہو چکی ہے) وہ کوشلیا سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتا ہے اس کی سخت ملامت اور میرے ارادے کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ کوشلیا کو برا لگتا ہے۔ لیکن دس بارہ دن بعد جب وہ اپنی ملازمت پر رینالہ خُرد واپس جانا چاہتی ہے اور یہ مسئلہ پیش آتا ہے کہ اس وقت جب اس کے اور میرے رشتے دار سخت ناراض ہیں وہ لاہور میں کہاں ٹھہرے ، تو میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ سیدھی بیدی کے ہاں چلی جائے اسے ذرّہ بھر تکلیف نہیں ہوگی۔ میں خط لکھ دوں گا ـــ کوشلیا بیدی سے ناراض ہے ، لیکن میری ضد کی وجہ سے وہاں چلی جاتی ہے ۔ بیدی اسے دیکھ کر ا جھجکا جاتا ہے ـــ لیکن پھر کوشلیا کے قول کے مطابق 'سب ٹھیک، ہو جاتا ہے اور اسے ذرہ بھر تکلیف نہیں ہوتی ۔ میرے سارے رشتہ داروں اور دوستوں میں صرف بیدی کی بیوی اسے دلہن کے طور پر شگن ڈالتی ہے ۔ بیدی کی نیک دلی سے کوشلیا مبہوت ہو جاتی ہے ۔ مجھے بیدی صرف اتنا ہی لکھتا ہے ۔ اپنے دل کے چو کھٹے

میں ہم نے مایا (میری دوسری بیوی) کا فوٹو لگا رکھا تھا اب اسے نکال کر اس میں کوشلیا کی تصویر لگا دی ہے۔ بیسیوں باتیں، بیسوں واقعات، یادوں کا ایک انبوہ ہے جو دل کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ میں کسے اپنی گرفت میں لوں۔ کس کا پہلے ذکر کروں........

الہ آباد کے شروع کے دن ہیں۔ متواتر کام کر کے کوشلیا نے اپنی صحت خراب کر لی ہے۔ وہ خاصی کمزور ہو گئی ہے۔ کوئی ایسا رفیق یار۔ یا رشتے دار نہیں جس کے یہاں میں اسے بھیجوں اور اسے پریشانی نہ ہو۔ میں اسے بمبئی بیدی کے ہاں بھیج دیتا ہوں۔ وہ تار نہیں دیتی اور چلی جاتی ہے۔ بیدی ناراض ہوتا ہے کہ اسے تار کیوں نہیں دیا گیا، وہ اسٹیشن پر جا کر لے آتا۔ کوشلیا کہتی ہے، میں تھرڈ کلاس میں آتی ہوں۔ آپ فرسٹ میں سفر کرتے ہیں۔ کاریں گھومتے ہیں۔ شاید مجھے ریسیو کرنے میں آپ کو الجھن ہوتی ہے۔........ بیدی بھڑکتا ہے۔ میں کیا نواب ہو گیا ہوں یہ سالی کار بھی کوئی فخر کرنے کی چیز ہے۔ آپ میری توہین کر رہی ہیں۔ کیا میں ایسا گر گیا ہوں کہ دوست کی بیوی کو اسٹیشن پر لینے بھی نہ جاؤں۔ کوشلیا معافی مانگ لیتی ہے۔ کچھ دن بعد میں ایک ایک خط دونوں کو لکھتا ہوں۔ بیدی کے خط میں لکھتا ہوں۔ کوشلیا کو بھیجا ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس کا خیال رکھنا۔ کوشلیا کو لکھتا ہوں۔ دفتر کے کام کی اور میری فکر چھوڑ کر مکمل آرام کرو۔ پڑھو۔ لکھو کچھ نہیں تو تاش کھیلو........................

دونوں ایک دوسرے کے خط پڑھ لیتے ہیں۔ بیدی عموماً تاش نہیں کھیلتا۔ کم سے کم میں نے اسے زندگی میں کبھی تاش کھیلتے نہیں دیکھا لیکن اسی شام وہ جا کر بازار سے تاش لے آتا ہے اور اپنا سارا کام چھوڑ کر روز ایک گھنٹہ سب کو ساتھ لے کر تاش کھیلتا ہے۔ واپسی سے ایک دن پہلے میرا چھوٹا لڑکا شکایت کرتا ہے۔ انکل ہم پاپا کے ساتھ آتے تو وہ ہم کو خوب گھماتے آپ نے ہم کو گھمایا نہیں۔ بیدی اپنے تمام تر پروگرام رد کر دیتا ہے اسے سردار جعفری سے کسی فلمی کہانی کے سلسلے میں بات چیت کرنا ہے۔ وہ آتا ہے تو بیدی اسے سمجھا دیتا ہے۔ بچے نے طعنہ دیا ہے، اسے کل واپس جانا ہے۔ یہ اشک سے جا کر کیا کہے گا..... اور کار میں اسے ساری بمبئی گھماتا ہے۔

مجھے خبر ملتی ہے کہ میرا چھوٹا بھائی کہیں بمبئی چلا گیا ہے اور وہاں ٹھگوں کے چکر میں پھنس کر پولیس کے باعث پریشان ہو رہا ہے۔ وہ مجھ سے پانچ سو روپیہ بھیجنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ میں بیدی

کو اس کا پتہ دیتا ہوں بلکہ لکھتا ہوں کہ اس سے ملاقات کرے اور کم سے کم جتنے روپیہ میں اس کا کام چل جائے اسے دے دے۔ بیدی سب کام چھوڑ کر میرے چھوٹے بھائی سے ملتا ہے اور دو سو روپیہ دے کر اسے رہا کرلاتا ہے۔

میں کچھ دوستوں کے زور دینے کی وجہ سے راجیشور پرساد سنگھ (پریم چند کے ہم عصر افسانہ نگار) کے ناول اور پروڈیوسر چوپڑہ کی فلم 'دھول کا پھول' کے جھگڑے میں الجھ جاتا ہوں۔ میں الہ آباد میں گواہی دیتا ہوں۔ چوپڑہ راجیشور پرساد سنگھ اور ان کے سبھی گواہوں کے خلاف بمبئی میں ایک جھوٹا مقدمہ دائر کر دیتے ہیں ہمارے نام باضمانت وارنٹ جاری ہو جاتے ہیں۔ میں وارنٹ کی تعمیل نہیں ہونے دیتا۔ بیدی کو فون کرتا ہوں کہ وہ وارنٹ بلا ضمانت جاری نہ ہونے دے۔ کوشلیا کو بمبئی بھیجتا ہوں۔ بیدی فلموں کے افسانے لکھتا ہے مکالمے لکھتا ہے۔ اس کا لڑکا اس حق میں نہیں کہ بیدی انکل کے معاملے میں الجھے اور اپنا نقصان کرے۔ لیکن بیدی کہتا ہے۔ تمھارا انکل کے پھانسی پر چڑھ جائے تو میں پھانسی چڑھ جاؤں یہ تو ذرا سی بات ہے اور اپنی مصروفیت کے باوجود وہ دن رات ایک کر دیتا ہے۔ اور اس مقدمے سے بھی نجات دلوا دیتا ہے۔

میرا بڑا بیٹا امیش چھٹی بار گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ بیٹے کی فراری سے قبل باپ اسے ڈانٹتا ہے کہ وہ بمبئی جانا چاہتا ہے تو شوق سے جائے۔ لیکن باپ کا بیٹا ہے تو اس کے کسی دوست سے کسی طرح کی امداد حاصل نہ کرے۔ سوتیلی ماں کے "ظلم" اور باپ کی بے پرواہی کا رونا رو کر اس کے دوستوں کی ہمدردی نہ جگائے اپنے باپ کے دوستوں کے ہاں رہنے اور ان سے مالی امداد لینے سے کہیں بہتر ہے کہ وہ اپنے باپ کے پاس رہے۔ کہ اگر وہ کسی کی امداد لیے بغیر کامیاب ہو جائے گا تو اس کے باپ کا اس پر فخر ہوگا۔ باپ کو یقین ہے کہ اس کا بیٹا اس دلیل کے آگے جھک جائے گا۔ لیکن وہ نہیں جھکتا۔ نہیں رکتا۔ بھاگ جاتا ہے اور اس بار ایک بھی پیسہ ساتھ نہیں لے جاتا۔ باپ سمجھتا ہے کہ پہلے کی طرح اس بار بھی بمبئی جائے گا اور اس کے دوست احباب کو پریشان کرے گا۔ وہ سبھی دوستوں کو خط لکھتا ہے لیکن بیٹا تو اسی کا ہے۔ وہ اپنے باپ کے کسی دوست سے نہیں ملتا۔ اپنا نام بدل لیتا ہے۔ اور آر۔ کے اسٹوڈیو (چیمبور) کی کینٹین میں ملازم ہو جاتا ہے۔ سبھی دوستوں میں صرف بیدی کا جواب آتا ہے کہ وہ کار لے کر بمبئی کے سبھی اسٹوڈیو دیکھ آیا ہے۔ امیش کا پتہ نہیں لگا وہ مجھے تسلی دیتا ہے کہ میں گھبراؤں نہیں۔ اگر امیش بمبئی میں ہوگا تو وہ اسے ڈھونڈ نکالے گا۔ چھ ماہ بعد اس کا خط آتا ہے

کہ ایشں بمبئی میں بے صحت ہے۔ سب میں بے کار فکر نہ کروں اور اس کے پیچھے نہ پڑوں۔ اس نے لڑکے سے باتیں کی ہیں۔ وہ اپنی زندگی جینا چاہتا ہے۔ میں اسے اس کی زندگی جینے دوں۔ "لٹ ہم ہیو اے فلنگ ایٹ لائف۔" (LET HIM HAVE A FLING AT LIFE) بیدی لکھتا ہے۔ "لٹ ہم (LET HIM BE)" میں لکھتا ہوں "لیکن اس پر نظر رکھو ہفتے پکھواڑے اس سے ملتے رہو۔ کہیں وہ اور آگے نہ بھٹک جائے۔ اور اگر کبھی دیکھو کہ اسے گھر کی یاد آتی ہے تو مجھے فوراً اطلاع دو . . . .

دو سال بعد بیدی کا خط مجھے ملتا ہے کہ تم ایشں کو فوراً بلوالو۔ میں کچھ بیمار ہوں۔ کوشلیا کو بھیج دیتا ہوں۔ چھوٹے لڑکے کو ساتھ لے کر کوشلیا بمبئی جاتی ہے۔ بچے کو اس لیے ساتھ کر دیتا ہوں کہ ہو سکتا ہے سوتیلی ماں کے باعث نہ آئے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی سے محبت کرتا ہے۔ اسے دیکھے کا تو رہ نہیں سکے گا . . . . اور دہی ہوتا ہے۔ بیدی ایشں کو دونوں کے آنے کی اطلاع دیتا ہے ایشں تیش میں بیٹھا بیدی کے گھر کے چکر لگاتا ہے اور جب اس کی نظر اپنے چھوٹے بھائی پر پڑتی ہے تو چلا آتا ہے۔ اس کے پاس اچھے کپڑے نہیں۔ کوشلیا ان کپڑوں میں اسے الہ آباد لانے کو تیار نہیں۔ بیدی سب انتظام کرتا ہے۔ تبھی کوشلیا کو بمبئی ہی میں پتہ چلتا ہے کہ اس کا اپنا بھائی پاگل ہو گیا ہے اور کہیں جوہو کی خاک چھانتا گھوم رہا ہے۔ بیدی کوشلیا کو تسلی دیتا ہے خود جا کر اسے لے آتا ہے۔ اس کی داڑھی بڑھی ہے۔ بال گرد سے اٹے ہیں کپڑے میلے کچیلے اور خستہ و بوسیدہ ہیں۔ وہ آکر فرش پر بیٹھ جاتا ہے بیدی اسے زبردستی اٹھاتا ہوا بھرائے ہوئے گلے سے کہتا ہے "اوتے تنی تو یار فرش تے کیوں بیٹھ گیا ایں" "اوتے تیرں سانوں بھل گیا ایں۔ ایدر کوچ تے بیٹھو۔" وہ اسے بغل گیر کر لیتا ہے اور بڑی محبت سے کوچ پر بٹھا دیتا ہے۔ کوشلیا کی آنکھیں پرنم ہو آتی ہیں . . . . .

ہمدردی۔ رحم دلی۔ دردمندی یعنی عجیب سا کمپیشن (COMPASSION) فلسفے کی پوٹ لیے ہوئے کچھ عجیب سی روحانیت حقیقتوں پر زبردست گرفت اور زندگی سے نبرد آزما ہونے کی بے پناہ استعداد۔ بیدی کا وجود کچھ اسی قماش میں سے تیار ہوا ہے اور نگاہ رکھنے والوں کو اس کے ادب میں بھی ان کا عکس مل جائے گا۔ درمیانہ قد۔ بھرا بھرا جسم، چہرہ پر بھی ترشی ہوئی داڑھی کچھ عجیب سا بھولا پن تجسس اور اشتیاق لئے ہوئے گہری آنکھیں سر پر بڑی محنت سے بجی دستار سلک کی قمیض قیمتی ٹائی اور بڑھیا سوٹ۔ سکھ ہونے کے باوجود بیدی کو پان میں تمباکو کھاتے اور سگریٹ پیتے اور داڑھی ترا شتے یا کسی حسینہ کی نظروں کا شکار ہوتے یا بیوی کے علاوہ کسی دوسری کی محبت میں

گرفتار دیکھ کر ہو سکتا ہے رومانیت والے فقرے کو پڑھ کر یا سن کر کسی کے ہونٹوں پر طنز آمیز مسکراہٹ کھیل جائے لیکن بیدی کا یقین مذہب کے رسوم ورواج یا قواعد وقوانین پر یعنی اس کے ظاہر پر نہیں ہے۔ اس نے مذہب کی روح کو پکڑ لیا ہے اسے جپجی صاحب ازبر ہے اور نانک بانی کا حوالہ وہ بات بات میں دیتا ہے۔ وحدت کے فلسفے میں اس کا دخل ہے۔ اور ہونی یعنی DESTINY میں اسے اس حد تک یقین ہے کہ جوتشی سے مشورہ لینے کو وہ 'اس' (اوپر والے) کی مرضی میں دخل دینا خیال کرتا ہے یوں وہ انسان ہے اور فلمی دنیا کے نہایت ظالم اور دغاباز ماحول میں رہتا ہے، انسان ہے اور اس نا طے غلطیاں کرتا ہے لیکن مجھے یقین نہیں کہ وہ دیدہ دانستہ کسی پر ظلم توڑ سکتا ہے۔ یوں اسے غصہ آتا ہے۔ میں نے اسے غصے سے پاگل ہو کر چلاتے اور واہی تباہی بکتے دیکھا ہے گھر ہی میں نہیں باہر بھی......

ریڈیو کشمیر کی نوکری چھوڑ کر اور پاکستان میں اپنا گھربار لٹا کر جب وہ تقریباً مہاجر کی سی حیثیت میں بمبئی پہنچا تو بین الاقوامی شہرت کے مالک انگریزی کے ایک ادیب کے ہاں کرائے پر کچھ دن رہا تھا وہ ادیب اس کے دوست تھے۔ پنجابی تھے ترقی پسند تھے لیکن مالک مکان تو مٹی کا بھی برا ہوتا ہے۔ وہ روز کوئی نہ کوئی نکتہ نکالنے لگے۔ یہاں تک کہ بیدی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ایک دن وہ خم ٹھونک کر ان کے مقابل جا کھڑا ہوا اور انہیں خالص پنجابی میں صلواتیں سنانے لگا وہ ادیب حیران و ششدر کھڑے دیکھتے رہ گئے، کیوں کہ وہ بیدی کو نہایت بے ضرر قسم کا مسکین اور منہ بولا آدمی سمجھتے تھے بیدی نے اگرچہ تیسرے دن مکان بدل لیا۔ لیکن ان صاحب کو اس سے کبھی آنکھ ملانے کی جرأت نہیں ہوئی۔

بیدی کسی زمانے میں ضرور بے ضرر اور مسکین قسم کا دبو انسان رہا ہوگا (اور اس کا خمیازہ اسے گھر اور باہر دونوں جگہ بھرپور بھگتنا پڑا ہے) لیکن زندگی سے لگاتار جہد کرتے اور اس پر فتح پاتے ہوئے اس میں بے پناہ ضد اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے۔ اپنی میٹھی میٹھی لیکن تیکھی چھری ایسی پھبتیوں سے وہ اپنے مخالفوں کو لاجواب کر دیتا ہے۔ اپنے لطیفوں، چٹکلوں اور طنز آمیز باتوں سے وہ محفلوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ وہ دوسروں کا ہی مذاق نہیں اڑاتا اپنا بھی اڑاتا ہے اور کئی بار تو اپنا مذاق اڑا کر دوسرے کا تختہ کھینچ دیتا ہے۔ اور یہ اس کا ایک آزمودہ اور کارگر حربہ ہے۔

بات کرنے اور پھبتی کسنے میں کرشن چندر کا بھی جواب نہیں تھا۔ اپنے اوپر کسی گئی ایک پھبتی کی ٹیس آج بھی میرے دل میں باقی ہے۔ الہ آباد کی ایک ادبی محفل میں پاکستانی رسالوں کے کچھ ایڈیٹروں کی بیوقوفی کا ذکر چلا تو میں نے شکایت کی کہ وہاں پریم چند کی ایک کہانی گلی ڈنڈا کسی نے میرے نام سے شائع کر دی۔ کرشن نے آہستہ سے کہا، لیکن اس کی شکایت تو پریم چند کو ہونی چاہیے۔ اور محفل قہقہہ

زار بن گئی۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی مجھے کوئی جواب نہ سوجھا۔ لیکن کرشن پر بیدی کی اور بھی تیز پھبتی مجھے یاد ہے۔ اس زمانے میں او م پرکاش راج کمل پرکاشن دلّی کے مینجنگ ڈائرکٹر تھے۔ انھوں نے اپنے آفس کے کمرے میں کرشن اور بیدی کے اعزاز میں ایک چھوٹی سی پارٹی دی ڈاکٹر لکشمی نارائن لال نے بظاہر کرشن کو مسکہ لگاتے ہوئے، کہا۔ کرشن جی لکھتے کیا ہیں "جادو جگاتے ہیں"۔ بیدی دھیرے سے بولا "یہ جادو ہی جگاتا رہے گا یا کبھی کہانی بھی لکھے گا۔" اور میں نے دیکھا کرشن کا منہ کانوں تک لال ہو گیا اور اس سے جواب نہ بن پڑا۔ اسی سلسلے میں مجھے ایک اور قصہ یاد آیا ہے۔ ایک بار بمبئی کی فلمی محفل میں فلمی افسانہ نگار نیا سرحدی خاصہ بور کر رہا تھا۔ آدھ پون گھنٹے سے لگاتار باتیں کئے جا رہا تھا اور کسی دوسرے کو بولنے نہ دے رہا تھا۔ جبھی بیدی پہنچا۔ دلیپ کمار نے اس سے کہا۔ بیدی صاحب یہ آدمی نہایت بور کر رہا ہے۔ ہم آپ کو جب مانیں جب آپ اسے چپ کرا دیں۔ بیدی نے کہا۔ یوں تو بہت مشکل ہے، لیکن زیادہ باتیں کرنے والے کبھی نہ کبھی موقعہ دے دیتے ہیں وعدہ نہیں کرتا، لیکن میں کوشش کروں گا۔ اور دوسرے ہی لمحے بیدی کو موقعہ مل گیا۔ افسانہ نگار ایک مشہور پروڈیوسر کو گالیاں دے رہا تھا کہ وہ اتنا بدتمیز، بے ادب، نامعقول اور ناہنجار ہے کہ میں اسے ایک فلم کی کہانی سنا رہا تھا اور وہ بغیر کان دیئے اپنی لڑکیوں کو پیار کیے جا رہا تھا۔ میری نجمہ میری سلمٰی،...... کہ اچانک بیدی نے کہا۔ صاحب وہ ٹھیک کر رہا تھا۔

معاً سبھی کی نظریں بیدی کی طرف اٹھ گئی۔

"وہ سوچ رہا تھا۔" بیدی نے کہا۔ "کہ اس کی کہانی پر فلم بنالی تو ان بچیوں کا کیا ہوگا۔" اس پر وہ زور کا قہقہہ بلند ہوا اور افسانہ نگار ایسا خاموش ہوا کہ اس نے لب نہیں کھولے۔

روزانہ زندگی میں بھی بیدی مذاق کا یہ پہلو پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی فلم گرم کوٹ آؤٹ ہوئی تھی رپورٹ اچھی نہیں تھی دلّی میں اس کا پریمیر دیکھ کر وہ کلکتہ جا رہا تھا جہاں کہ وہ دکھائی جانے والی فلم تھی۔ الہ آباد اسٹیشن پر میں اس سے ملا تو میں نے پوچھا "کیسی چل رہی فلم؟" ہنس کر بولا سینما ہال کی طرف لوگ آتے تھے تو ہیمنگوے کے اولڈ مین کا سا حال ہوتا تھا لحظہ بھر رک کر بولا۔ تم نے ہیمنگوے کا ناول اولڈ مین اینڈ دی سی، پڑھا ہے نا۔ وہ بڈھا کشتی میں بیٹھا اپنے آپ بڑبڑاتا ہے آؤ پھنسو مچھلیوں آؤ۔ لیکن مچھلیاں ہیں کہ صاف نکل جاتی ہیں اور فقرہ ختم کیے بغیر زور سے ہنس دیا۔

بیدی کے خطوط بھی ہمیشہ طنز و مذاق سے بھرے رہتے ہیں۔ کتنا بھی چھوٹا خط کیوں نہ ہو ایک نہ ایک فقرہ وہ ایسا ضرور چست کر دے گا کہ لطف آجائے اس کے خطوط کو پڑھنا اس کے ادب کو پڑھنے سے کم مزہ نہیں دیتا۔ اپنے ایک خط میں "رنگولی" کے فلاپ ہونے اور سر پر ۸۰ ہزار قرض چڑھ جانے کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا "میں یقیناً پاگل ہو رہا ہوں۔ کیونکہ مجھے سبھی دوسرے پاگل دکھائی دیتے ہیں" پھر چند سطروں کے بعد یہ کہ میں نے یہ سب تمھیں اس لیے لکھا ہے کہ تم کہتے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا۔۔۔۔ اور آنوے اور اوپیندر ناتھ اشک کی بات کا مزہ بعد میں آتا ہے۔

مجھے معلوم نہیں مکر و فریب سے بھری فلمی دنیا میں۔ جہاں میں ایک دن بھی کھل کر نہیں ہنس سکا بیدی کس طرح اتنے برسوں سے خوش و خرم بسر کیے جا رہا ہے۔ لیکن دھرم اور فلسفے نے اسے کچھ عجیب سی بے نیازی بخش دی ہے۔ دوسروں کی بیوقوفیوں کے ساتھ وہ اپنی حماقتوں پر بھی قہقہے لگا سکتا ہے۔ غم و اندوہ کے ٹریجک موقعوں پر آنسو بہاتے ہوئے اور بھگوان کو کوستے ہوئے میں نے اسے کوئی نہ کوئی لطیفہ سنا کر اس غم کو ہلکا کرتے دیکھا ہے۔ خود سکھ ہونے کے باوجود وہ سکھوں کے لطیفے سنا سکتا ہے۔ وہ غیض و غضب کی حالت میں بیوی کا گلا گھونٹ دینا چاہتا تھا۔ لیکن قدم بڑھانے سے پہلے وہ اس کے پہلوے سوچنے لگتا تھا اور اسے کافی پلانے یا سینما دکھانے لے جاتا تھا (اور اب جب اس کی بیوی اسے نجات دے گئی ہے) وہ اس کے تمام مظالم بھول گیا ہے اور اس نے اس پر جو ظلم کیے ان کی یاد سے تکلیف پاتا رہتا ہے اس کے لڑکے جب کوئی ایسی بات کہتے ہیں جس سے اسے ذہنی اور روحانی کوفت ہوتی ہے تو وہ پہلے بے حد تلملاتا ہے۔ پھر جب سوچتا ہے کہ اس نے بھی اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تھی (خواہ دل میں ہی سہی) تو وہ انھیں معاف کر دیتا ہے اور حالانکہ اب وہ آزاد ہیں خود بال بچوں والے ہیں۔ کھاتے کماتے ہیں ان کی ذرا سی تکلیف سے پریشان ہو جاتا ہے۔ ابھی اسی یکم اپریل کو کسی نے فون کر دیا کہ اس کی چھوٹی بہو (جو بچے سے تھی) نانا وتی ہسپتال میں نازک حالت میں ہے بیدی کو بلانے (ایک آرٹسٹ) نہایت ضروری بات کر رہا تھا۔ اس کے نوکر نے ناشتہ تیار کیا تھا۔ لیکن بغیر اپنے بڑے لڑکے کو فون کر کے اطلاع کی جانچ کیے وہ جیسے کھڑا تھا ویسے باہر نکل گیا اور مجھ سے کہتا گیا کہ اس کے بڑے لڑکے اور بہو کو فون پر اطلاع کر دوں۔ بیدی بہ مشکل باہر نکلا ہو گا کہ میں نے بڑے

لڑکے نریندر کو فون کیا۔ اس نے کہا آج پہلی اپریل ہے باؤجی چلے تو نہیں گئے کسی نے ان کا اپریل فول نہ بنایا ہو؟...... لیکن بیدی جا چکا تھا میں نے نریندر سے کہا کہ اس کے پاس ہی لکو کا گھر ہے ذرا اپنے ڈرائیور کو بھیج کر پتہ منگائے۔ چند منٹ بعد فون آیا کہ لکو اور اس کی جرمن بہو مزے سے بیٹھے ہیں اور کوئی ویسی بات نہیں۔

اور بیدی غریب ناناوتی ہسپتال ہی نہیں گیا اور دوسرے ناناوتی ہسپتال کبھی پہنچا۔ وہ بلڈ پریشر کا مریض۔ اس دوران اس نے اتنی تیز کار چلائی کہ کوئی حادثہ ہو سکتا تھا اور یہ بات اس کی اس بہو اور لڑکے کے بارے میں، جو ستونت کے رحلت کرنے کے بعد گذشتہ دو مہینے میں ایک بار بھی اپنے باپ کو دیکھنے نہیں آئے نہ انھوں نے کبھی فون پر ہی اس کی طبیعت کا حال چال پوچھا ہے...... میں نے کبھی اس کی شکایت کی ہے تو بیدی نے ہمیشہ ان کی طرف سے بات کی ہے۔ ہونی کو اٹل ماننے اور جوتشیوں سے مشورہ لینا اس کی مرضی میں دخل دینا گرداننے کے باوجود کبھی کبھار جوتشی کے بھی ہو آتا ہے۔ برسوں کھانے پینے کے باوجود ایک بار برسوں پہلے اس نے اپنی بیوی کی خوشی کے لیے شراب کباب سے توبہ کر لی۔ اور اب وہ اگرچہ کھاتا بھی ہے اور باقاعدہ پیتا بھی ہے اور ایک نوجوان حسینہ کی محبت میں گرفتار بھی ہے لیکن طبیعت کے ان تمام تر تضادات کے باوجود بیدی ایک فقیر منش آدمی ہے اور اگرچہ وہ مجھ سے پانچ چھ برس چھوٹا ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ چھوٹے بھائی کے برابر جانا ہے۔ اور یہ یاد کرنے کی حکم نما فرمائش کی ہیں۔ لیکن جب کبھی میں اس سے ملا ہوں۔ میرے دل میں ہمیشہ اس کے لیے عقیدت پیدا ہوتی ہے۔

جوتشی لوگ مانتے ہیں کہ دوستی یا دشمنی موافق یا مخالف ستاروں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جوتشی اور نجوم میں میرا کچھ ویسا یقین نہیں۔ لیکن آج سے ٹھیک چالیس برس پہلے میں اپنی زندگی کے اس دن کی یاد کرتا ہوں۔ جب گرہوں کی ایسی ہی شام میں بیدی سے ٹکرا گیا تھا تو مجھے محسوس ہوتا ہے۔ جوتشیوں کی بات میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ یقیناً اس شام میرا کوئی اچھا ستارہ نمودار ہوا ہوگا۔ کیوں کہ تقریباً نصف صدی تک جو دوستی ایک جیسی حالت میں بنی رہے اور روز بہ روز گہری ہوتی جائے۔ وہ گذشتہ جنم کے کسی کار ثواب کے باعث ہی قائم ہو سکتی ہے۔

میری پچاسویں سال گرہ پر میرے بارے میں مضمون لکھتے ہوئے بیدی نے ہماری پہلی ملاقات کا جو قصہ لکھا ہے۔ اس کی مجھے کوئی یاد نہیں۔ مجھے جس شام کی یاد ہے وہ گرہوں کی ایک شام تھی یہی اپریل مئی کا مہینہ تھا۔ پچھلے دسمبر میں میری بیوی کی وفات ہو چکی تھی اور میں بے حد اداس اپنے گھر میں

بیٹھا رہتا تھا۔ نہ کسی سے ملتا جلتا تھا نہ کسی سبھا سوسائٹی میں جاتا تھا جبھی کرشن چندر نے آکر کہا
”چلو اشک، ایسے کیا بیٹھے ہو۔ قریب ہی وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے ہال میں حلقۂ ارباب ذوق کی ایک
میٹنگ ہو رہی ہے اس میں راجندر سنگھ بیدی کہانی پڑھ رہا ہے۔

بیدی کا نام میں نے اپنے بڑے بھائی سے سنا تھا۔ وہ خود تو آج کل دلّی میں لوگوں کے
دانت لگاتے یا اکھاڑتے ہیں۔ لیکن ادب سے ان کا پرانا لگاؤ ہے۔ اب تو نہایت مصروف ہو جانے
کے باعث اتنا نہیں پڑھ پاتے لیکن لاہور کے زمانے میں تو کوئی ایسا ناول یا افسانوں کا مجموعہ نہیں تھا
جسے وہ دیمک کی طرح چاٹ نہ جاتے ہوں۔ انھوں نے بیدی کا ایک افسانہ کسی رسالے میں پڑھا تھا اور
مجھ سے کہا تھا دیکھو اشک یہ نیا ادیب بہت اچھا لکھتا ہے۔ میں نے افسانے کا نام پڑھا۔ ”بھولا“ نیچے
مصنف کا نام لکھا تھا۔ راجندر سنگھ بیدی۔ میں وہیں دکان پر بیٹھے بیٹھے افسانہ پڑھ گیا اور مجھے اس میں
کچھ ایسا بھولا پن۔ کچھ ایسی بے ساختگی۔ کچھ ایسا آرٹ لیس آرٹ دکھائی دیا کہ مجھے لگا۔ اردو ادب
میں ایک نئے ستارے کا طلوع ہوا ہے یہی بات میں نے بھائی صاحب سے کہی بھی۔ لیکن اس کے
باوجود میں اس مجلس میں نہ جاتا اگر کرشن یہ نہ کہتا۔ ”یار ہمارے ہاں کی مجلسیں یکسر پھُسّ ہوتی ہیں
کوئی تنقید و نقید نہیں ہوتی۔ تم چلو گے تو کچھ مزہ رہے گا۔ اور میں چلا گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وائی ایم سی۔ اے میں خاصہ جمگھٹ تھا۔ لاہور کے قریب قریب
سبھی چوٹی کے ادیب موجود تھے۔ میں اپنی اداسی کا مارا سب سے پیچھے دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔
شاید ہم لوگ کچھ تاخیر سے پہنچے تھے کیوں کہ کچھ ہی دیر بعد حلقۂ ارباب ذوق کے سکریٹری شیر محمد اختر
نے جو مجلس کی کارروائی چلا رہے تھے، بیدی سے اپنا افسانہ پڑھنے کی درخواست کی۔ میں نے بیدی کو
اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا ہوگا تو اس ملاقات کی مجھے کوئی یاد نہیں۔ سکریٹری نے جب اس کا
نام پکارا تو مجھلے قد کا پتلا دبلا ایک سکھ نوجوان اپنی سیٹ پر اٹھا۔ سر پر بڑی صفائی سے سجی ہوئی
دستار اور بدن پر سستے کپڑے کا لیکن صاف سوٹ۔ میں نے بہت خوبصورت سکھ نوجوان دیکھے تھے۔
ان کے مقابلے میں بیدی مجھے اتنا خوبصورت نہیں لگا۔ نہ اس کی ناک ہی ستواں نہ اس کا رنگ ہی
گورا۔ لیکن نہ جانے یہ اس کے اندر کا درد مند اور رحم دل فنکار تھا، یا فلسفی یا حکیم یا دوسرے پر
آسانی سے یقین لے آنے والا سادہ لوح انسان۔ جو اس کے چہرے پر منعکس ہو کر اسے کچھ عجیب
سی کشش بخش رہا تھا (آج بھی کسی حد تک وہ کشش اس کے چہرے میں موجود ہے) وہ سہمے
ہوئے لہجے میں افسانہ سنانے لگا۔ میں تو اس کی تنقید کرنے کے خیال ہی سے گیا تھا اس لیے

نہایت غور سے سننے لگا۔

بیدی کا کہانی سنانے کا انداز منفرد اور پرکشش ہے۔ جنھوں نے بیدی کو افسانہ یا ناول سناتے دیکھا ہے (ہاں بیدی اپنے ناول تک ایک مجلس میں سنا جاتا ہے) وہ جانتے ہیں افسانہ سنانے میں اسے کمال حاصل ہے۔ درد بھرے حصوں میں اس کا گلا بھر آتا ہے اور آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں اور مزاح یا طنز بھرے حصوں پر اس کے ہونٹ ہنسی میں کھیل جاتے ہیں یا طنز سے پچک جاتے ہیں۔ اس کی آواز بہت باریک نہ موٹی۔ درمیانے سُر میں وہ اپنی چیز پڑھتا چلا جاتا ہے۔ مجھے آج بھی اس کہانی کا نام یاد ہے۔ "ہمدوش"! آج میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ بیدی کی عظیم کہانیوں میں سے نہیں ہے...... لیکن اس وقت جب اس نے کہانی ختم کی تو ہال اس کی تعریفوں سے گونج اٹھا۔ عاشق بٹالوی۔ ممتاز مفتی۔ شیر محمد اختر۔ مولانا صلاح الدین احمد مرزا ادیب۔ سب نے اس کی داد دی۔ جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہانی اچھی ہے، لیکن مجھے اس کے انجام سے اتفاق نہیں۔ میرے خیال میں کھیٹرا مفتی کے جنازے میں "میں" نام کے مریض کا کندھا لگنا ضروری تھا۔ وہ صحت مند ہو جاتا ہے۔ اپنے ہمدوش کے جنازے کو کندھا ہی لگا پاتا ہے یا ٹانگ کٹی ہونے کے باوجود وہ جنازے کو کندھا دینا چاہتا ہے۔ لیکن گر جاتا ہے کہانی کا یہ انجام اس کے عنوان میں معنی پیدا کرتا ہے۔ تھوڑی سی تبدیلی سے فن کے لحاظ سے افسانہ کہیں اوپر اٹھ جائے گا۔

میں نے چند ہی فقرے کہے ہوں گے کہ ہال میں شور مچ گیا مولانا صلاح الدین احمد نے جنھیں بعد میں بیدی مذاقاً مُلانا ملاحدین کہنے لگا تھا کہا کہ میں نے اس تنقید سے افسانے کا سارا مزہ کرکرا کر دیا ہے۔ بیدی کا رنگ لال ہو گیا۔ اس نے میری تنقید کی مخالفت کی تو میں نے نہایت یقینی لہجے میں کہا۔ "آپ کچھ دن بعد اپنے افسانے کو دوبارہ پڑھیں گے اور میرے سجھاؤ پر غور فرمائیں گے تو یقیناً میری بات سے متفق ہوں گے۔"

بیدی لاہور کے جنرل پوسٹ آفس میں کلرک تھا اور میں قریب ہی اپنے بڑے بھائی کی دوکان کے پیچھے ماہی رام اسٹریٹ میں مقیم تھا اور ڈاک ڈالنے کے لیے بڑے ڈاک خانے جایا کرتا تھا کچھ دن بعد ایسے ہی میں مال روڈ پر بیدی سے ملاقات ہو گئی میں شاید ڈاک ڈالنے جا رہا تھا اور وہ اپنا دن بھر کا کام نمٹا کر آ رہا تھا مصافحہ کرنے کے بعد بیدی نے مجھ سے کہا کہ گھر جا کر اس نے میری بات پر غور کیا تو اس میں کافی سچائی لگی اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ مجھ سے کئی برسوں سے ملنا چاہتا تھا۔ پانچ برس پہلے

اس نے 'چندن' میں میرا افسانہ پڑھا تھا تو مجھ سے ملاقات کرنے کی غرض سے امرت دھارا روڈ کے عقب میں (جہاں میں ان دنوں رہائش رکھتا تھا میرے گھر گیا تھا لیکن ہمت نہ کر پایا تھا۔ اور دروازہ کھٹکھٹائے بغیر وہاں سے واپس آگیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب سن کر مجھے بڑی مسرت ہوئی اور میں اسے اپنے گھر لے آیا باتوں باتوں میں خاصی دیر ہوگئی۔ وہ انار کلی سے میل ڈیڑھ پرے رشی نگر میں رہتا تھا میں اسے اس کے گھر چھوڑنے گیا۔ ہم لگاتار باتیں کرتے۔ یعنی میں باتیں کرتا اور وہ سنتا گیا اور باتوں اور ملاقاتوں کا یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک کہ بیدی کی تبدیلی لاہور چھاؤنی میں نہیں ہوگئی ان مسرت بھری شاموں کی یاد میرے دل و دماغ پر صبح کے کسی ایسے شیریں خواب کی یاد سی میٹھی چھاپ چھوڑ گئی ہے جو یاد رہ جاتا ہے اور بھلائے نہیں بھولتا۔ کبھی میں بیدی کو ڈاک خانے جا پکڑتا اور کبھی وہ میرے ہاں آجاتا۔ ہم لگاتار باتیں کرتے۔ افسانوں کے بنیادی خیالات یا پلاٹ ایک دوسرے کو سناتے۔ باہمی دکھ درد سنتے۔ وہ ڈاک خانے میں ۵۴ روپیہ ماہوار پاتا تھا اور میں بیوی کی وفات کے بعد نوکری دوکری کا خیال چھوڑ، قانون کی کتابیں فروخت کر دن بھر لکھتا پڑھتا تھا۔ اور میری آمدنی بھی پچاس ساٹھ سے زیادہ نہ تھی کبھی باتوں میں دیر ہو جاتی تو میں بیدی کو وہیں کھانے پر مجبور کر دیتا۔ وہ اپنی خوب صورت لیکن سخت گیر بیوی کے غصہ کی فکر چھوڑ کر میری بات مان لیتا۔ گھر میں صرف دال پکی ہوتی میں بھاگ کر نیچے سے دو پیسے کی لال شکر لے آتا۔ گھی ان دنوں اصلی مل جاتا تھا شکر میں گرم گرم گھی ڈال کر ہم کھانا کھا لیتے پھر کبھی میں اسے گھر چھوڑنے جاتا تو اس کے ہاں دیر ہو جانے کے باعث اچانک کھانا کھانے کی خواہش کرتا۔ ستونت کہتی۔ سالن ختم ہو گیا ہے۔ میں کہتا "دودھ تو ہوگا" اسی سے کھا لوں گا۔ اور کھا لیتا اور وہیں سو بھی جاتا ــــــ ہم دونوں گھنٹوں مال پر گھومتے گول باغ کی روشوں پر ٹہلتے۔ لاجپت رائے کے بت کے سامنے ٹھہر جاتے اور دنیا جہان کی باتیں کرتے۔ ویسی گھلاوٹ، ویسی مٹھاس مجھے کہیں کسی دوست کی صحبت میں ملی میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ اسی لیے سوچتا ہوں اس شام ضرور میرا کوئی اچھا ستارہ بلند ہوا ہوگا۔

دس پندرہ برس پہلے میں بمبئی آیا تھا۔ بیدی نے میرے اعزاز میں سبھی ادیبوں کو 'چیتنا' میں پارٹی دی تھی اور اس میں کہا تھا کہ میں نے اشک سے ہیئت کے سلسلے میں بہت کچھ سیکھا ہے میں سمجھتا ہوں بیدی نے اپنی عادت کے مطابق فراخ دلی سے کام لیا۔ اس کے متعلق لوگوں نے مجھ سے یہ بات کئی بار کہی ہے کیوں کہ بیدی دوستوں کی محفل میں کئی بار اس کا اعادہ کرتا ہے اور لوگ پوچھتے ہیں کہ میں نے

اس سلسلے میں اسے کیا سکھایا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے اسے کچھ نہیں سکھایا۔ میں نے صرف اس کے افسانے غور سے سنے، پڑھے۔ اور جو مجھے اچھے لگے ان کی تعریف کی اس کی طرزِ تحریر اور فن اس کا خاص اپنا اور انفرادی ہے اور اس کی نقل تک کرنا آسان نہیں۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ بیدی کی شروع کی کہانیاں سنیں تو اسے بتا دیا کہ اس کی کون سی کہانی اچھی ہے اور کس راستہ پر اسے گامزن ہونا چاہئے۔

آج تو بیدی میں اپنے فن کے متعلق ایک زبردست خود اعتمادی — ضرورت سے کچھ زیادہ ہی — پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن اس زمانے میں نہ جانے کن اسباب سے اس میں خود اعتمادی کا یکسر فقدان تھا۔ وہ بہت اچھی کہانی لکھتا۔ اس کی تھیم اور اس کے نبھاؤ میں کچھ ایسا نیا پن ہوتا کہ میں دنگ رہ جاتا اور وہ نہایت لجاجت سے کہتا "یار تم دیکھو یہ کچھ بنی بھی ہے یا نہیں" مجھے برسات کے ایک اتوار کی یاد ہے۔ وہ دن بیدی کے ساتھ گذاری گئی شاموں کی یاد کی طرح نہایت خوشگن نقش چھوڑ گیا ہے۔ اگست کا مہینہ تھا۔ بیدی سے نئی نئی دوستی ہوئی تھی۔ اپنی تنہائی اور اداسی مجھے بے طرح کھلتی تھی جبھی ایک اتوار آسمان پر گہری گھٹا گھر آئی اپنے کمرے میں بیٹھے رہنا میرے لیے دوبھر ہو گیا۔ میں اٹھا اور رشتی نگر کی طرف چل دیا۔ بیدی کے گھر پہنچتے پہنچتے پانی آگیا اور میں قدرے بھیگ گیا جب بیدی نے دروازہ کھولا اور میں بیٹھک میں داخل ہوا تو ہم دونوں نے طے کیا کہ برستے پانی میں راوی کی سیر کی جائے۔ سن کر ستونت نے اندر صحن سے کہا "پہلے تو گھر میں ایک پاگل تھا اب دوسرا بھی شامل ہو گیا ہے" اس نے اصرار کیا کہ اس مہم پر چلنے سے پہلے ہم چائے کا ایک ایک پیالہ پیتے چلیں — استونت نے چائے کا پانی چڑھا دیا تو بیدی نے کہا۔ جتنے میں چائے بنتی ہے میں آپ کو ایک کہانی سناتا ہوں دیکھئے تو اس میں کیا نقص ہے۔ میں نے ادب لطیف کے سالنامے کے لیے بھیجی تھی لیکن کمبخت ایڈیٹر نے اسے واپس کر دیا ہے۔

ادب لطیف کے ایڈیٹر مرزا ادیب تھے۔ "صحرا نورد کے خطوط" کے نام سے انھوں نے لمبے لمبے افسانے لکھے تھے جنھیں پڑھنا کارے دارد والا معاملہ تھا ہندی میں ان کے جوڑ کا ایک ہی مدیر ہے اور وہ ہے میرا پڑوسی بھیرو پرشاد گپت۔ فرق یہی ہے کہ بھیرو ترقی پسند کہلاتے ہیں اور مرزا رجعت پسند۔ باقی دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ بیدی نے کہانی پڑھی "پان شاپ" مجھے بے حد پسند آئی۔ ڈاک خانے میں چٹھیاں سارٹ (SORT) کرتے ہوئے بیدی کے سامنے ہر روز نئے نئے نام آتے تھے وہ انھیں اپنے افسانوں میں بھر دیتا۔ پان شاپ کے فوٹوگرافر کا نام بھی عجیب تھا۔ تھارو لال۔ لیکن افسانے میں بیدی کی وہی دردمندی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ میں نے

اس کی خوب تعریف کی اور کہا۔ تم بے فکر رہو۔ یہ ادبِ لطیف کے سال نامے میں ضرور چھپے گا
بارش کا زور اس دوران ختم ہو گیا تھا۔ پانی۔ ننھی ننھی بوندوں میں برس رہا تھا۔ چائے پی کر
ہم رتی نگر کے عقب سے بھیگتے ہوئے ننگے پاؤں راوی کی طرف چل دیئے۔ اس زمانے میں جزیات
نگاری کا بڑا رواج تھا۔ اس سیر میں ہم نے بہت سی جزیات اکٹھی کیں [افسوس ہے کہ وہ کسی
بھی افسانے کے کام نہیں آئیں] راوی پر پہنچ کر ہم نہائے اور پھر جرنیلی سڑک سے واپس آئے۔
بیدی نے قدرتی طریق علاج میں اپنے یقین کی بات بتائی اور اس کے فوائد گنوائے۔ مجھے افسوس
ہے کہ میں اس کے تجربات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکا اور ہمیشہ بیمار رہا۔ لیکن وہ پورا دن
— دنیا کے تمام تفکرات کو چھوڑ کر وہ ننھی ننھی بوندوں میں ننگے پاؤں کھیتوں اور سڑکوں پر
آوارہ گھومنا — شاید میری زندگی کا سب سے مسرت اور سکھ بھرا دن تھا اور اس دن کی
بے فکری اور خوشی کی یاد آج بھی تازہ ہے۔ میں نے کچھ ہی دن بعد اپنے گھر میں ایک چائے کی پارٹی
رکھی اس میں کرشن چندر۔ موہن سنگھ۔ سنت سنگھ سیکھوں، مکتبہ اردو کے مالک چودھری نذیر
کے علاوہ کچھ اور ادیب دوست تھے۔ میں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ میٹنگ میں میں اپنا افسانہ
"داچی"، "کرشن" "دو فرلانگ لمبی سڑک" اور بیدی "پان شاپ" پڑھے گا۔ چائے کے بعد جب ہم
دونوں اپنے افسانے پڑھ چکے تو بیدی سے افسانہ سنانے کی درخواست کرنے سے پہلے میں نے
تمہیداً اعلان کیا کہ بیدی نے ایک زبردست افسانہ لکھا ہے اور میں بیدی سے درخواست کروں گا
کہ وہ اسے سنائے۔ بیدی نے افسانہ سنایا اور میں نے اس کی خوبیوں کی تشریح کی تو میرے بعد
سب نے بہ یک زبان اس کی داد دی۔ میٹنگ ختم ہوئی تو جس افسانے کو ادبِ لطیف کے ایڈیٹر نے
لوٹا دیا تھا۔ اسے رسالے کے مالک چودھری نذیر بہ اصرار سال نامے کے لیے لے گئے۔ جب وہ افسانہ
سال نامے میں چھپا تو پڑھنے والوں اور ادیبوں اور نقادوں نے اس کی اتنی تعریف کی کہ
افسانے کی دنیا میں بیدی کی دھاک جم گئی۔

لیکن میرے خیال میں بیدی کا نام جن افسانوں کے باعث زندہ جاوید رہے گا وہ نہ
'ہم دوش' ہے نہ 'پان شاپ'! اس کی بہترین کہانیوں میں 'بھولا'، 'چھوکری کی لوٹ'، 'گرہن'،
'غلامی'، 'دیوالہ'، 'لاجونتی'، 'اپنے دکھ مجھے دے دو'، 'حجام الٰہ آباد کے'، 'ٹرمینس سے پرے'، 'ببل'، اور 'صرف
ایک سگریٹ'، ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ کنہیا لال کپور نے ایک بار لکھا تھا۔ 'بیدی تھیم کا بادشاہ ہے'، میں

سمجھتا ہوں کہ بیدی وہ سیپ ہے جس کے منہ میں نہ جانے کیسے، نہ جانے کہاں سے، کسی نازک سے خیال کا ذرہ آپڑتا ہے اور وہ اس پر اپنے فن کی آب چڑھا کر اسے ایک بیش قیمت موتی میں تبدیل کر دیتا ہے بیدی کی بہترین کہانیاں دوبارہ پڑھنے پر دوگنا مزہ دیتی ہیں اور میرے نزدیک یہی اعلیٰ فن کی خوبی ہے۔

مجھے بیدی سے کبھی دوری کا احساس نہیں ہوا۔ اگرچہ ہم زیادہ اکٹھے نہیں رہے۔ کچھ دنوں لاہور میں اکٹھا ہو کر ہم جدا ہو گئے میں دلی میں تھا تو وہ لاہور۔ وہ دلی پہنچا تو میں بمبئی۔ وہ بمبئی آیا تو میں الہ آباد چلا گیا۔ لیکن مجھے وہ ہمیشہ اپنے قریب لگا ہے۔ ہم مہینوں خط و کتابت نہیں کرتے۔ لیکن کبھی محسوس نہیں ہوا کہ ہم دور ہیں میں نہیں سمجھتا دوستی کو مستقل بنانے کے لیے خط و کتابت کچھ ویسی ضروری ہے۔ خیال کا ایک شعر ہے:

ہجر کیا چیز ہے دوری کا فقط ایک خیال
ورنہ محبوب کبھی پہلو سے کبھی جاتا ہے

اور بیدی میرا ہم دم اور دوست ہی نہیں میرا محبوب بھی ہے۔

میں جب ۱۹۷۸ء کی گرمیوں میں اپنے ہونٹوں کے کینسر کا علاج کرانے بمبئی گیا تھا، اور بیدی اپنی نئی فلم 'آنکھن دیکھی' فلمانے میں مصروف تھا تو تین چار مہینے اس کے ہاں شیٹھیا سدن ماٹنگا کے فلیٹ پر رہا تھا۔ (مندرجہ بالا مضمون میں نے انھیں دنوں اردو میں لکھا تھا) بیدی کی رفیقۂ حیات ستونت اللہ کو پیاری ہو چکی تھی اور چونکہ اس کی وفات میں اپنی فلم کی ہیروئن 'سمن' سے بیدی کے والہانہ عشق اور اس کی دوسری بے راہ روی کا بھی ہاتھ تھا۔ اس لیے بیدی ان دنوں احساس گناہ سے پشیمان تھا۔ فرسٹریشن میں روز پینے لگا تھا، چونکہ رات کی بے خوابی سے ڈرتا تھا۔ دن دن بھر فلم کی شوٹنگ کرتا۔ رات کو دو پیگ پینے کے بعد پاکستانی مغنیہ کا ایک ریکارڈ لگا دیتا۔ روز وہی ریکارڈ اور ایک نہایت پُردرد آواز میں فیض کی غزل کے الفاظ کمرے میں گونج اٹھتے۔

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی
کب تک تری راہ دیکھیں اے قامت جانانہ
کب حشر معین ہے، تجھ کو تو خبر ہوگی

بیدی غزل کے الفاظ دوہراتا، سر دھنتا۔ شعروں کی تشریح کرتا اور گانے والی کو پیار بھری گالیاں

دیتا۔ اپنے آپ کو بھلانے کی کوشش میں سمن سے اس کا عشق کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا۔ چونکہ میں بور ہو رہا تھا۔ اس لیے میں شوٹنگ پر بھی چلا جاتا۔ میں نے فلم میں ایک چھوٹا سا رول بھی کیا۔ چونکہ میں نے دنیا کا سرد و گرم بیدی سے زیادہ دیکھا ہے، اس لیے وہ جیسی زندگی جی رہا تھا۔ وہ دیر تک چل نہیں سکتی تھی۔ میں نے اسے بار بار خبردار کیا کہ سمن صرف ہیروئن بننا چاہتی ہے اور اس کا عشق اسے لے ڈوبے گا وہ جیسی زندگی جی رہا ہے، ہائی بلڈ پریشر اور ذیابیطس کی وجہ سے کسی دن اسے فالج گر جائے گا۔ کچھ اسی طرح کے حالات میں میں نے ہندی کے مشہور اور یونانی دیوتا سے خوبصورت شاعر بال کرشن شرما نوین کو فالج سے بیمار، بے کس و بے بس دیکھا تھا۔ میں نے بیدی کو لاکھ خبردار کیا۔ لیکن وہ کچھ اس طرح بے بس ہو گیا تھا کہ زیادہ ٹوکنے پر اس کے اور میرے تعلقات میں ہلکی سی کشیدگی بھی آ گئی۔ لیکن میں نے اسے ہمیشہ چھوٹا بھائی سمجھا۔ اس کی بیوی میں اس میں دسیوں بار میں نے جھگڑے نمٹائے اس لیے اسے خبردار کرنا میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔ بمبئی میں اس کے ہاں میرے لمبے قیام کا صرف ایک اچھا نتیجہ نکلا کہ مجھے لگاتار لکھتے دیکھ کر بیدی نے ایک نہایت خوبصورت کہانی لکھی 'باپ بکاؤ ہے' (ہماری زندگی میں ایسا کئی بار ہوا ہے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت اچھے افسانے لکھے ہیں) بیدی نے اس کے کئی ورشن لکھے۔ آخری ورشن میں افسانہ بہت اچھا بن گیا۔

بہر حال میں واپس الہ آباد آ گیا۔ بیدی کی فلم ختم ہو گئی۔ ادھر فلم مکمل ہوئی ادھر اس کی ہیروئن نے شادی کر لی۔ جیسا کہ بیدی کے ایک خط سے معلوم ہوا۔ اس نے ساتویں منزل سے کودنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن شاید دوستوں نے پکڑ لیا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ بیدی کو فالج کا دورہ پڑا۔ اس کی ایک آنکھ کا آپریشن ہوا اپنے جس لڑکے سے اسے شکایت تھی۔ (جو روپیہ بے دریغ خرچ کرتا تھا، لیکن اسے بیوقوف سمجھتا تھا) اسی کے رحم و کرم پر اسے رہنا پڑا۔ گذشتہ دو برسوں میں بیدی جس ذہنی اور جسمانی تکلیف سے گذرا ہے، کانپتے ہاتھ اور بے راہ رو قلم سے لکھے اس کے دو خط شاہد ہیں۔ میں پچھلے دنوں دلی میں اس سے کئی بار ملا ہوں اور مجھے بے حد تکلیف ہوئی ہے۔ بیدی کمزور ہو گیا۔ اس کے دماغ کا ایک حصہ قدرے ماؤف ہو گیا ہے۔ اس کی زبان میں لکنت آ گئی ہے۔ اس کی ہنسی اور بات بات میں مذاق کی عادت جاتی رہی ہے اس کی ایک ٹانگ قدرے چھوٹی ہو گئی ہے اور وہ قدرے لنگڑا کر چلنے لگا ہے۔ اس کی پرانی بے اعتمادی واپس آ گئی ہے۔ میں سریندر سہگل کے ہاں اس کے ساتھ کاوچ پر بیٹھا تھا۔ کہ اچانک اس نے کہا۔ "یار اشک۔ ایک تمہی ہو، جو میرے افسانوں کی اتنی تعریف کرتے ہو

کیا سچ مچ میں نے اتنے اچھے افسانے لکھے ہیں"۔۔۔۔ بالکل اسی طرح جسے وہ ۱۹۳۸ء میں رشی نگر لاہور کے اپنے مکان میں پوچھا کرتا تھا۔

اس کا یہ سوال سن کر اچانک میرا دل بھر آیا۔ میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے کس طرح اپنے آپ پر قابو رکھا۔ اور اسی طرح اس کی عظمت اور انفرادیت کا یقین دلایا جس طرح میں لاہور میں دلایا کرتا تھا۔ ہاں دل ہی دل میں میں نے اس دن کو کوسا جب ادب کے سونے کو چھوڑ کر فلمی شہرت کے لوہے کو اپنایا تھا۔ جب میں دلی گیا، اس مسئلہ پر میری اس کی بحث ہوئی۔ میں نے ہمیشہ اس پر زور دیا کہ وہ میری طرح فلمی زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر اپنی زندگی کو ادب کی خدمت میں لگائے۔ میں چاہتا تھا۔ وہ الہ آباد آجائے اور وہاں پریس کھول لے۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ جب تک میں اس کا پریس جما نہیں دیتا، میں اس کے ساتھ رہوں گا۔ لیکن اس نے کہا "بیس سال اس زندگی میں رہ کر میں ناکام ہو کر اسے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میں ایک شاندار فلم بناؤں گا اور اسے چھوڑ دوں گا۔

لیکن میں جانتا تھا، وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔ اس بار دلی میں بھی اس نے وعدہ کیا کہ اب وہ الہ آباد آجائے گا۔ میری بیوی نے اسے یقین دلایا کہ وہاں لڑکے ہیں، پوتے ہیں۔ اس کا دل بھی لگا رہے گا، اسے کسی قسم کی تکلیف بھی نہیں ہوگی اور جب وہ کچھ ٹھیک ہو جائے گا تو پھر لکھنا بھی شروع کر دیگا۔ بیدی نے وعدہ بھی کیا تھا۔ لیکن بمبئی جا کر اس نے کوئی خط نہیں لکھا۔ اس کا لڑکا کبھی خط کا جواب نہیں دیتا۔ چونکہ میرا چھوٹا لڑکا جو، ہمارا کاروبار گذشتہ پندرہ برس سے سنبھالے تھا، اچانک بی۔ بی۔ سی لندن میں ملازم ہو گیا اور بڑھاپے کے باوجود مجھے بیس برس بعد پھر کاروبار کے تار تھامنے پڑے اس لیے میں الہ آباد سے نکل نہیں پایا لیکن شاید ہی کوئی دن جاتا ہوگا جب ہم بیدی کے بارے میں نہ سوچتے ہوں کئی بار تو میں اور کوشلیا گھنٹوں اس کی باتیں کرتے رہتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اسے صحت کامل عطا کرے۔ اور بیدی کچھ اور ایسے افسانے لکھے جو صرف وہی لکھ سکتا ہے۔

یہ مضمون سن کر میرے دوست نے کہا کہ میں نے جتنے ادیبوں پر تذکرے لکھے ہیں۔ ان میں کردار کے مثبت منفی دونوں پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے، لیکن بیدی کے کردار کے منفی پہلوؤں کو میں کیوں نظر انداز کر گیا ہوں۔ بیدی سے کبھی مجھے تکلیف نہ ہوئی ہو۔ کبھی ہمارے درمیان غلط فہمی پیدا نہ ہوئی ہو، کوئی جھگڑا نہ ہوا ہو، ایسی بات نہیں، وہ سب ہوا ہے۔ لیکن بیدی کو میں نے ہمیشہ ایک شریف اگرچہ کافی کمزور انسان پایا ہے۔ اس کی شرافت نے ہمیشہ میرے دل میں اس کے لیے عزت اور

عقیدت پیدا کی ہے اور اس کی کمزوری پر ہمیشہ افسوس ہوا ہے۔ اس کی شرافت نے ہمیشہ دوسروں کو فائدہ پہنچایا ہے۔ اس کی کمزوری نے ہمیشہ اس کا اپنا نقصان کیا ہے۔

آج جب بیدی مجبور اور بے بس اپنے بیٹے کے فلیٹ میں پڑا ہے، میرے دل میں ہر لحظہ اس کے حق میں دعا نکلتی ہے ــــ خدایا، اس شریف انسان کو اور تکلیف نہ دے۔ اسے صحت عطا کر کہ وہ اردو ادب کو کچھ اور ایسے شاہکار دے، جو صرف وہی دے سکتا ہے۔ ☐

راجندر سنگھ بیدی

نیلمی اپارٹمنٹ۔ ۲۴۲ لنکنگ روڈ
کھار۔ بمبئی ۵۲

چشمۂ بددور

یہ واقعہ بھی سنیچر ہی کے روز ہوا۔ تم کہوگے کہ تمھارے ساتھ سارے سارے واقعات سنیچر ہی کو کیوں ہوتے ہیں؟ تو بولو میں کیا جواب دوں، یہی کہہ سکتا ہوں نا۔ کہ ہفتے کے باقی دنوں میں تو میں واقعات کو ہونے نہیں دیتا ہوں۔۔۔

بات سیدھی ہے، باقر بھائی، سنیچر کے دن میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے ایک دن پہلے کوئی چھٹی نہیں ہوتی۔ (ہاں سال میں ایک دن ہوتی ہے۔ البتہ گڈ فرائی ڈے والے دن، لیکن چند لوگوں کی بدقسمتی سے بعض اوقات گڈ فرائی ڈے بھی اتوار کو آپڑتا ہے اور ان کی تعطیل ماری جاتی ہے) لیکن سنیچر کے روز کوئی ایسی قیامت نہیں ہوتی۔ ایسی سکہ بند چھٹی آتی ہے کہ آدمی سب کی چھٹی بھلا کے رکھ دیتا ہے۔ وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ سنیچر سے ایک دن پہلے اسے جمعہ کی نماز پڑھنی پڑی تھی۔ نماز تو خیر فرض ہے، اتوار کو بھی۔ لیکن تم سچ بتاؤ باقر بھائی، اپنی سلمیٰ کی قسم کھاؤ۔ کیا اتوار کو تمھاری نماز یا نمازوں پہ قضا نہیں چھائی ہوتی؟

سنیچر کی صبح کو البتہ کائنات کے نمبر دو (پیسے نہیں) ستارے، جسے تم زحل اور ہم ہندو لوگ سنیچر کہتے ہیں، کو تھوڑا رشوت دینی پڑتی ہے، اور بس۔ رشوت صرف اتنی ہے کہ بس مندر جاؤ جس کے بغل میں ایک دکان ہوگی، ہمیشہ ہوگی، جہاں سے تیل، ناریل، ہار وغیرہ مل جائیں گے۔ وہاں سے سرسوں کے تیل کی ایک پلی خرید و۔ سرسوں کا نہ ملے تو کھوپرے ہی کا چلے گا، جو پچیس پیسے میں مل جائے گا۔ تیل ڈالنے کے لئے لوہے کی کٹوری تیل والا خود ہی دے گا۔ اور اس کے لئے کوئی الگ دام نہیں لے گا۔ کیوں کہ مورتی پہ چڑھاوا ہو جانے کے بعد وہ کٹوری اپنے آپ تیل والے کے پاس چلی آئے گی، مع تیل کے۔ تو، لوہے کی کٹوری میں تیل، تیل میں چند دانے ماش کے اور ایک پیسہ تانبے کا۔ پہلے تو یہ ہی ہوتا تھا، لیکن آج کل تو نہ تانبا رہا ہے نہ پیسہ۔ پیسہ کی جگہ پانچ، دس پیسے نکل ہے اور تانبے کی جگہ نکل نے۔ جو کسی نہ کسی طرح سے تمھاری جیب سے نکل ہی آئے گا۔ یہ سب لے کے چلو۔ کیوں کہ دیوتا لوگ

بھی موقع شناس اور معاملہ فہم ہو گئے ہیں اور حالات کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا سیکھ گئے ہیں۔ بات یہ ہے، باقر — سنیچر کا تعلق ہر کالی چیز سے ہوتا ہے جس کا دان واجب ہے۔ مثلاً لوہا، ماش، کالا کپڑا، بجری، نبردو کا پیسہ، قلم، تمھارا دل۔ لیکن دان کے سلسلے میں تم لوہے کی کٹوری میں تیل تک بچالو پھر۔ بہت سنا اڑ دو۔

ہاں جو کام پچیس پیسے میں ہو جائے، اس کے لئے لاکھوں کا کیا سوچنا؟ تیل کی پلی میں اپنا منہ دیکھتے ہوئے مندر کو جاؤ۔ اور جاتے میں صرف تیل ہی میں دیکھو۔ اور چلتے جاؤ چاہے ٹھوکر ہی کیوں کھاؤ۔ تمھیں اس میں اپنا چہرہ، اپنے باپ کا دکھائی دے گا، جس میں کوئی شرم کی بات نہیں۔ ٹھاکر دوار پہنچو تو جوتا اتار دو۔ اتار لو میں نے کب کہا ہے۔ آخر دھرے ہوئے ہونا؟ جوتا مندر سے باہر بیٹھی ہوئی عورت کی تحویل میں دے دو۔ یہ بہت ضروری ہے۔ تم عورت کو جانتے ہی ہو نا۔ اگر تم جوتا اس کے ہاتھ میں نہیں دو گے تو وہ خود لے لے گی، جوتے کے بعد مندر میں جاؤ اور باہر کا سب بھول جاؤ۔ مورتی کے سامنے سر نہوڑاؤ تو کسی عورت کا خیال دل میں نہ لاؤ، چاہے وہ اپنی ماں ہی کیوں نہ ہو۔ پھر کوئی جاپ، کسی اسم اعظم کا ورد کرو۔ اگر یاد نہیں تو نہ سہی۔ کوئی ایسی بات دل میں دہراؤ جس میں کم سے کم وزن یا ترنم تو ہو۔ ایک بات تمھیں بتا دوں کہ سب دیوی دیوتا، پیر پیغمبر گدّ یعنی نثر کے بہت خلاف ہیں، اس لئے کچھ بھی یاد نہ آئے تو یہی کہتے جاؤ۔ لالہ موتی چھ چھ پیسے، لالہ موتی چھ چھ پیسے...... یہ تمھیں ریل گاڑی کی آواز معلوم ہوتی ہے نا؟ ریل گاڑی ہمیشہ وہی کہتی ہے، جو تم کہتے ہو۔ ایسے ہی بھگوان بھی وہی کہتا ہے جو تم کہتے ہو۔

مندر سے باہر آؤ گے تو پہلا بردان سنیچر کا یہ ملے گا کہ اوپر تمھارے اینگل سے تمھیں جوتی رکھنے والی کے دودھ دکھائی دیں گے جن میں کوئی دودھ نہیں ہوگا۔ دوسرا یہ کہ چاہے تمھاری جیب میں پیسہ بھی نہ ہو، مگر بے شمار بچے تمھیں گھیر لیں گے — اور پکاریں گے، سیٹھ او سیٹھ..... بس دنیا میں جس کو عورت اور پیسہ مل گئے، اسے اور کیا چاہئے؟

معاف کرنا باقر بھیا۔ میں بات ذرا لمبی اور گھما پھرا کے کرتا ہوں۔ پروشن رک جانے سے میرا دماغ گھوم گیا نا۔ تمھارا جب اور جہاں جی چاہے ٹوک دینا۔ جن منتر میں آدمی کو جی تو حق ہے کہ جھوٹ کو وہ چاہے نہ روکے مگر سچ کو ضرور روکے....

بات میں سنیچر کی کر رہا تھا۔ لیکن اس زمانہ میں ایک بات اور دوسری میں ربط رکھنا بڑا کٹھن ہو گیا ہے ہمارے سب شاعر اور ادیب اس کے گواہ ہیں۔ پر وہ بھی کیا کریں، مہنگائی بھی تو کتنی بڑھ گئی ہے؟ قدروں میں اتھل پتھل ہو گیا۔ ربط تو گیا ہی تھا، ساتھ ضبط بھی گیا۔ معلوم ہوتا ہے، کسی نے ریسپرن کا ٹیکہ لگا دیا اور دماغ کا وہ

حصّہ ہی ماؤف ہوگیا جو بتاتا ہے کہ پہلے آپ یہ بات کر رہے تھے اور اب یہ کر رہے ہیں۔

ہاں میں سنیچر کی بات سے ذرا پرے ہٹ گیا، لیکن آرہا ہوں اس کی طرف ـــــ یہ چشمہ میرا دیکھ رہے ہو نا؟ اس میں ڈبل کونیکس کے شیشے لگے ہیں۔ عام آدمی ان میں سے دیکھے تو چیونٹی بھی اسے ہاتھی لگے گی۔ شاید اسی لئے میں روسی کونسلیٹ میں کام کرتا ہوں کیوں کہ روسیوں کو ہر چیز اپنے اصل سے سوگنا بڑی معلوم ہوتی ہے۔ عوام دنیا بھر کے عوام کے لئے انھوں نے بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن عوام کی اتنی گردان کی ہے کہ وہ خواص ہو گئے ہیں۔ تم دیکھنا اگلے پچاس برس کے اندر جو انقلاب آئے گا، وہ خواص ہی کا ہوگا۔ جس کی نیو سب انقلابوں کی ماں فرانس میں سارتر اور سار بون کے طلبا نے رکھ بھی دی ہے۔

میری یہ باتیں کونسلیٹ میں نہ کہنا اور نہ یہ بتانا کہ میں سنیچر رہا ہوں اور گیتو کی باتیں کرتا ہوں نہیں تو میری چھٹی ہو جائے گی، دھرم سے روسیوں کا یہ ہے نا کہ وہ کہتے نہیں ـــــ کرتے ہیں!

روسی محنتی بہت ہیں۔ ان کے دفتر میں جو کام کرتا ہے، اس کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم ہندوستانیوں میں خون ہے ہی نہیں۔ ہے تو ان کے گروپ کا نہیں۔ شاید ان کو پتہ چل گیا ہے کہ ہر ہندوستانی فطرتاً کام چور واقع ہوا ہے۔ اس کا بس چلے، بیکار میں پگار ملے تو کبھی کام نہ کرے مغرب میں ہر آدمی کی تمنا کہ وہ زندگی کے آخری سانس تک مصروف رہے، لیکن ہندوستانی یہ ہی سوچتا رہتا ہے کہ کب وہ ریٹائر ہوگا اور کام کے جھنجھٹ سے چھوٹے گا۔ بات وہ پانچ سال بعد کی کر رہا ہے لیکن ٹانگیں ابھی سے پسارنا شروع کر دیتا ہے۔ مجھ سے پوچھو تو میں بتاؤں ـــــ ہندوستانی دراصل کام ملنے سے پہلے ہی ریٹائر ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہاں کی آب و ہوا نہیں، بلکہ اس کے کرم اور عمل کا وہ فلسفہ ہے جس پہ ضرورت سے زیادہ ہی زور دینے سے وہ بے عمل ہو گیا ہے۔

ایک بات ہے، باقر بھائی کہ انسان آخر انسان ہے۔ روس اور امریکہ تو کیا، چاہے وہ ہندوستان ہی کا کیوں نہ ہو۔ اسٹیک اور شاشلیک کی جگہ ادلی دوسا، مونگ کی دال، مرغ مسلم یا کڑاہ پرشاد ہی کیوں نہ کھاتا ہو، مگر زندگی کی ہر چیز اسے بھی اچھی لگتی ہے ـــــ سنیچر کو مندر سے لوٹنے کے بعد میں نے انڈین ایکسپریس میں پڑھا کہ، لٹل ہٹ، ریستوران میں آج مریانا ناچ رہی ہے۔ مریانا ناچتے وقت اپنے بدن پر کہیں صرف انجیر کا پتا پہنتی ہے۔ ہاں بھائی لوگ اسے بھی پہننا کہتے ہیں۔ پھر سامنے وہ اپنے دودھ پر وہ مسمریزم کے دو نقطے سے پینٹ کر لیتی ہے حالانکہ ہماری عورتیں تو کپاس کا کھیت کا کھیت اپنے بدن پر اگا لیتی ہیں۔

میرے ایک دوست۔ ارے تم ہی تو تھے باقر جس نے بتایا تھا کہ مریانا کا رنگ گورا ہے نہ کالا۔ بس

عشق والا ہے۔ اس کا باپ لبنانی ہے اور ماں عراقی اور یہ سب کچھ مل کر لوگوں کو مراقی بنا دیتا ہے۔ وہ زیتون کے تیل کی مالش سے اپنے بدن کو اتنا لچکدار بنا لیتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اوپر کے حصے کا نیچے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ جیسے ہماری ٹرالی بسیں ہوتی ہیں نا جس میں ٹرالی پہ ڈرائیور ہوتا ہے اور پیچھے سواریاں اور ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر الٹ جاتی ہیں۔ مریانا کو دیکھنے والے بھی تو ایسے ہی الٹے، زخمی ہوتے ہیں مرجاتے ہیں..... میں نے تمھیں کہا تھا ناکہ عورت کے بارے میں ہر مرد کا ایک فینٹسی ایک خبط ہوتا ہے، چنانچہ میرا خبط اس کی کمر ہے۔ اور تم جانو، باقر بھائی دنیا کے سب فساد عورت کی کمر ہی سے شروع ہوتے ہیں!

تو سنیچر کی ایک شام کو میں نے ولادی میر، اپنے فوری اوپر کے افسر سے دو گھنٹے کی چھٹی مانگی، لیکن اس نے اتنے رباب سے "نیئت" (نہیں) کہا کہ مجھے اس کی نیت پہ شک ہو گیا ایسی قطعیت صرف روسی ہی کے لہجے میں ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ والے میز پر ولادی میر دارناف کا فوری افسر نکولائی کر پاٹکن بیٹھا تھا۔ اب روسی دفتروں میں ایسا ہوتا ہے کہ آپ اپنے فوری افسر کے اوپر کے فوری افسر سے بات نہیں کر سکتے اس لئے میں نے اپنی درخواست کو ولادی میر دارناف کے سامنے دہرایا، بیوی کی بیماری کا بہانا بنایا لیکن وہ جواب میں بولا نہیں کہیں بھی نہیں۔ مجھے زیادہ برا اس لئے نہیں لگا کہ میں جانتا تھا اس کی ہندی میری روسی سے بھی زیادہ کمزور ہے اس لئے گھونٹ کا خون پی کر رہ گیا۔ یعنی کہ چپ ہو گیا۔ چپ تو ہم پہلے ہی رہے تھے، مگر اب اور بھی چپ ہو گئے۔ یہ اور بھی چپ کیا ہوتی ہے۔ یہ تم نہ جان سکو گے، میری جان، کیونکہ تم دفتر کے بیاباں میں کبھی کھوئے ہی نہیں..... عام طور پر ہمیں دفتر سے چھ بجے چھٹی ہو جاتی ہے۔ ابھی پورے دس منٹ باقی تھے کہ میں نے اٹوانس سمیٹنا شروع کر دی اور ولادی میر کی طرف صرف اس لئے نہیں دیکھا کہ وہ ضرور میری طرف دیکھ رہا ہوگا۔ میرے دماغ میں مریانا کے بارے میں اپنے آپ ایک نظم چل رہی تھی ـــــ مریانا او مریانا، تیرے لئے آج، مرجانا..... کیسی ہے؟

کچھ دیر میں میں بس پکڑ کر لٹل ہٹ میں پہنچ گیا۔ لٹل ہٹ دراصل ایک بڑے ہوٹل کا حصہ ہے۔ اس کا نام ہی لٹل ہے، ورنہ اچھی خاصی جگہ ہے اس میں چیزوں کی وسعت کو آخر پیمانے ہی سے تو نہیں ناپا جاتا، ہمارے سامنے اور بھی بہت کچھ ہے۔ دیکھو نا اتنی بڑی کائنات اور پھر اس میں ماں کی گود.... میکرو کازم میں مائیکرو کازم۔ بمبئی شہر کی رونق بڑی ہے یا سلمٰی کی بانہوں کا سکوت؟ نصیبن کا برقعہ بڑا ہے یا مریانا کا انجیر کا پتا؟ اگر مالکوں نے دیواروں کو خاص رنگ کا اثر دے رکھا تھا، یا ان پہ ایسے ہی تجریدی چہرے ٹانگ رکھے تھے تو محض لوگوں کو بھرمانے کے لئے۔ بعض وقت بدصورتی

ارادے سے بھی پیدا کرنی چاہیے تاکہ دوسروں کو اپنے آپ خوبصورت لگے۔

للّی ہٹ ہر عمر، ہر نوع کے لوگوں سے پٹا پڑا تھا۔ اس کی وجہ صرف مریانا کا ناچ، اس کے بدن کا لوچ اور خوبصورتی ہی نہیں تھی، بلکہ وہ خلا بھی جسے پاٹنے کی خواہش شادی کے تیسرے چوتھے سال ہی مرد اور عورت میں پیدا ہو جاتی ہے اور یا پھر زندگی کی سادہ سی حقیقت کہ گھوڑے دوڑتے ہی اس وقت ہیں جب سامنے والے دوڑیں۔

کونے میں مجھے ایک سیٹ نظر آئی، جس کے ایک طرف کوئی دبلا پتلا منحنی سا آدمی بیٹھا تھا۔ وہ شکل سے لائبریرین معلوم ہوتا تھا۔ کمال کی بات ہے نا، باقر بھائی، تعارف پر وہ سچ مچ ہی یونائیٹڈ اسٹیٹس ان فارمیشن سروس کا اسسٹنٹ لائبریرین نکل آیا۔ تم کہو گے کہ لائبریرین کی کوئی خاص شکل ہوتی ہے؟ تو میں کہوں گا؛ ہاں اس کے چہرے ہی پہ کارڈ انڈکس ہوتا ہے جیسے ہر شاعر کی ناک میں تھوڑی رطوبت اور منہ میں زیادہ لعاب ہوتا ہے۔ پھر لائبریرین کی آنکھیں یوں گھومتی ہیں جیسے صفحے الٹ رہی ہوں۔ مریانا کی بات چھوڑو۔ اس کی کمر تو صفحیں الٹتی ہے...

اس اسسٹنٹ لائبریرین نے اپنی انگریزی میں بہت امریکی غنغنہ پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن ہندی کہیں نہ کہیں سے اپنا منہ باہر نکال ہی لیتی ہے بلکہ اس عمل میں ایک عجیب دوغلی سی چیز پیدا ہو گئی ہے۔ ہندوستانی غنغنہ! اس نے جو بش شرٹ پہن رکھی تھی اس پہ نیکس پلیکس کے فحش پلے چھپے ہوئے تھے، دھندلی سی پورنو تصویروں کے اوپر اور پھر ان سب کو ایک نیلی رنگ کی وسیع وعریض نکٹائی نے ایک حد تک چھپا رکھا تھا۔ نیچے بیل بوٹم کے اس نے جیسے ارادے سے پھونسڑے نکال رکھے تھے۔ چہرے پر دونوں طرف پشکن کی طرح کے بڑی بڑی قلموں کے گچھے... گویا وہ عام آدمی کا اور ہپی کے بیچ پیوند معلوم ہوتا تھا۔ وہ کوئی کتاب ہونے کے بجائے اس کا سرورق تھا!

یہ تم تھے؟ نہیں نہیں، تمہاری ہی طرح کا کوئی اور تھا، جس سے شادی کرنے کے لئے امریکہ سے ایک لڑکی ہپی فیرا گو لو (جس کے آبا و اجداد اٹلی سے جا کر امریکہ میں آباد ہو گئے تھے) آئی تھی۔ خیر فیرا گو کر دفاتر اور گولو کو مار و گولی، لیکن ایک بات اس نے آج کے ہندوستانی نوجوانوں کے بارے میں بڑے پتے کی کہی تھی یہ... امریکنوں سے بھی کچھ زیادہ امریکن ہیں۔ کیا مزے کی عورت تھی، باقر، واحد عورت جو مردے ملے بنا ہی اس سے کئی بار مل چکنے کا عالم پیدا کر لیتی تھی۔ آج کی دنیا میں سب سچ ہے، میرے بھائی، کل بڑھا نہیں کہ مرغ کو تکلیف دیئے بغیر ہی لوگ مرغی سے انڈے پیدا کرنے لگے ہیں... میں پھر بہک گیا اور تم کمینے بھی مجھے نہیں ٹوکتے۔ تم بھی ذہنی طور پہ وہ ہو... وہ... اب ہنستے کیوں ہو؟ پکڑے گئے نا؟

تم بھی اس لڑکی کی طرح سے ہو جس کے غسل خانے کا دروازہ غلطی سے کھلا رہ جاتا ہے۔

ارے ہاں، میں بھول ہی گیا۔ یہ عورتوں کا سال ہے۔ اقوام متحدہ کے مطابق۔ عورتوں کو تم جانتے ہی ہو۔ کیسے وہ اپنی کمزوری کا افسانہ مشہور کر دیتی ہیں۔ اور کمزوری کو بھول ہی جاتی ہیں۔ سال ختم ہونے دو۔ اگر عورت سالی نے اسے صدی پہ نہ پھیلایا تو مجھے باپ کا نہ کہنا۔

میں مرد شوونسٹ نہیں۔ اگر صدیوں سے مرد نے اسے روندا ہے تو اب وہ اسے روندے۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ وہ تو چپکے سے سامنے پڑی رہتی ہے، جیسے روندے جانے کی منتظر۔ اور اگر آپس میں مرد ذرا بھی سستی دکھائے تو کیسے اسے طعنے دیتی، ذلیل کرتی ہے ... خیر وہ اسے روندے یا یہ اسے، بات ایک ہی ہے عوام اور خواص کے بدل کی طرح .... مگر غضب خدا کا عورت جو حقہ بھی نہیں پیتی، حقوق مانگتی ہے!

ضروری بات تو بیچ ہی میں رہ گئی۔ پہلے سنیچر کاندھے پر چڑھ بیٹھا تھا، اب حیف کہ عورت سر پہ سوار ہو گئی ہے ... ضروری بات یہ کہ وہ اپنا لا بُہرِ ئین دوست بھی چشمہ لگاتا تھا۔ مجھ میں اور اس میں فرق یہ تھا کہ اس کے چشمے میں ڈبل کان کیو کے شیشے لگے تھے جیسے میرے میں ڈبل کنویکس کے۔ عام صحت مند نظر والا اگر ڈبل کان کیو میں سے دیکھے نا باتر بھائی تو اسے ہاتھی بھی چیونٹی دکھائی دے گا جیسے میرے میں چیونٹی بھی ہاتھی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکنوں کو دنیا کے سب لوگ کیڑے مکوڑے نظر آتے ہیں۔ یہ ویت نام اور مائی لائی کی بات نہیں کرتا۔ باقی دنیا ہی کو دیکھو۔ مصر اور اسرائیل میں انھوں نے کیا غدر مچایا ہے۔ ملکوں کو کیسے کیسے ہتھیار دے کر لڑوایا اور خود نفع کمایا ہے۔ شاید اس لئے ان ملکوں کے اپنے ہتھیار کند یا متروک ہو چکے ہیں۔ کوریا میں ۵۰ فی صدی جو لیکوریا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ پھر آلندے یا چلی کا حشر دیکھا ہی ہے نا تم نے؟ ارے وہ شیخ چلی دوسرا تھا .....

جیسے میں اپنے ڈبل کنویکس کی وجہ سے روسی کونسلیٹ میں ہوں، جو ڈبل کان کیو کی وجہ سے امریکی انفارمیشن سروس میں تھا۔ لیکن قدرت بھی ہم ہندوستانیوں سے عجیب عجیب طرح کے بدلے لیتی ہے۔ اس نے اچھی بھلی اسکاچ چھوڑ کر کینیڈا کی سی گرام کا آرڈر دے دیا، صرف اس لئے کہ وہ امریکہ کا پڑوسی ہے میں روسی ڈرنے والا تھوڑے ہی تھا! میں نے بھی واڈ کا کی حکم کے طریقے سے فرمائش کی، جیسے روسی کرتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ واڈکا روس کی نہیں، یہیں آس پاس کہیں کیرالہ میں کشید کی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے ہم دونوں میں کشیدگی پیدا ہونے لگی۔ ابھی ہمارے احساسات نے کوئی واضح شکل اختیار ہی نہیں کی تھی کہ بیچ میدان کے کود کے آ گئی ــــ مرلایا! گوانی آرکسٹرا میں سے جھانجے والے نے زور زور سے جھانجے بجائے۔ پردے کے پیچھے سے

بڑے کھرج والی پال رابسنی آواز آئی ـــــ مر . . . یا . . . نے . . . !

مجھے نہیں معلوم تھا کہ مریانا کو مریانے بھی کہہ سکتے ہیں، یا کہتے ہیں۔ میرے اندر جو نظم پیدا ہو رہی تھی، ایکا ایکی بد نظمی کا شکار ہو گئی۔ سب قافیے غلط ہو گئے۔ میرے ہوش اڑ گئے!

پھر گونجا آرکسٹرا ـــــ اور مریانا کا ناچ

چھک چھک . . . . . چھکا چھک

دھک دھک، دھکا دھک۔ ہے اے اے اے اے

ے ے ے! ـــــ اور کمر!

یہ سب نیگرو اسپرچول تھا نہ پی ہر لینی میوزک۔ کوئی دوغلی چیز تھی جو اب ہندوستانی کی بجائے افریقی ملغوبہ ہو گئی تھی۔ اصلی چھٹی تو ہوئی، جب مریانے نے کمر، ناف سے آواز نکال کر گانا شروع کیا ـــــ تم میرے لئے کیا لائے ہو؟

آرگل کی جرابیں لائے ہو ـــــ اچھا کیا اچھا کیا، تم میرے لئے کیا لائے ہو؟

موزنبیقی موتیوں کی مالا لائے ہو ـــــ اچھا کیا، اچھا کیا،

مون مارت کا عطر لائے ہو ـــــ اچھا کیا، اچھا کیا

میں تو تمھارے لئے کچھ نہیں لائی، جان! . . . . میرے پاس تو ایک دل ہے، جو صرف تمھارے لئے ہی دھڑکتا ہے . . . . . اور پھر

اچھا کیا، اچھا کیا . . . .

ارے باقر میاں، مرد بڑا الو کا پٹھا ہے . . . . . وہ جانتا بھی ہے کہ ہال میں اس ایسے سینکڑوں دوسرے ـــــ تیسے بھی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ یہی سمجھتا ہے اور سمجھنا چاہتا ہے کہ وہ جو بھی کہہ رہی ہے مجھی سے کہہ رہی ہے۔ ٹِل ہٹ، میں لڑکیاں بھی تھیں مگر ان کا مت پوچھو، وہ یا تو مریانا کی نظروں سے مردوں کو دیکھ رہی ہوں گی اور یا پھر سیدھے اس کے لباس کو۔ حقیقت باقر بھائی جلیبی کی طرح سے سیدھی ہے ـــــ مرد سب سے زیادہ کیا پسند کرتا ہے ہم ـــــ عورت! عورت سب سے زیادہ کیا پسند کرتی ہے ـــــ شاپنگ!

اس سلسلے میں تم تیار ہو، باقر، چونکہ یہ عورتوں کا سال ہے ہمارا تمھارا سب کچھ بک جانے والا ہے ڈیمانڈ اتنا بڑھ جائے گا کہ سپلائی بند ہو جائے گی!

ایک بات اور بھی ہے۔ آزاد ہو کر شاید یہ عورتیں ہماری عزت کرنے لگیں، ہم عورتوں کی جتنی عزت کرتے ہیں یہ خود عورتیں بھی نہیں جانتیں . . . . . تم ہی بتاؤ، ہم نے کبھی کسی کو باپ بھائی کی گالی دی ہے؟ . .

کیا بتاؤں دوست! مریانا کے ناچ گانے سے فُل ہٹ کے رجنی گندھا اور ڈاھلیا تو ایک طرف کیکٹس بھی جھومنے لگے تھے . . . . دیکھو اب تم شرارت مت کرو۔ خدا گواہ ہے کہ کیکٹس کے سلسلے میں میرا اشارہ قطعاً سردارجی لوگوں کی طرف نہیں ہے۔ ایسا کروگے تو مجھے پٹوا دوگے۔ اگر میں ان کی بات کرتا تو کہتا کیکٹس بھی لٹکنے لگے تھے، پھکنے لگے تھے۔ بہت وہ کرتا تو کہتا۔ بھکنے لگے تھے۔ جھکنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟!

کچھ دیر بعد مریانا اپنا "لباس"، انجیر کا پتہ بدلنے کے لئے اندر چلی گئی تھی اور میں ہوش میں آنے کی بجائے جوش میں آچکا تھا قافیے میرے سامنے یوں کھل گئے جیسے میرا ذہن نوراللغات ہے لیکن بدقسمتی میرا اس اسسٹنٹ، بلکہ سسٹنٹ لائبریرین سے جھگڑا ہوگیا۔ بات یوں ہوئی کہ میں پہاڑی کی دھن پر ڈھیر دیھیرے گانے لگا۔ پھر دماغ ہی تو ہے نا۔ میرا خیال اس عظیم مغنی سہگل کی طرف چلا گیا اور میں نے اس کارڈ انڈکس سے پوچھا ـــــ آپ کو یاد ہے، سہگل کب مرا تھا؟ جانتے ہو، کیا جواب دیا اس نے؟ بولا ـــــ ابھی ابھی، میرے سامنے ہی تو مرا ہے . . . .

یہ امریکی سالے ـــــ واٹرگیٹ والے۔ اپنا اسلحہ دوسرے ملکوں میں بھیج کر انھیں لڑواتے ہیں خود منافع کھاتے ہیں۔ ہم روسی بھی بھیجتے ہیں، لیکن ہتھیاروں کو بیکار کرنے، دنیا میں امن لانے کے لئے میں نے سوچا کیوں نہ میں ان کے ہتھیار انہی پہ استعمال کروں۔ مجھے امریکی مارک ٹوئین یاد آگیا۔ میں نے خالص روسی دبدبے سے اپنے مزاح کی حس کو تھوڑا ڈِل کر کے اس سے پوچھا۔ آپ جانتے ہیں ایک لائبریرین اور گدھے میں کیا فرق ہے؟ ہو سکتا، اس آناً فاناً کے سوال سے سیدھے ہی لڑائی شروع ہو جاتی، لیکن وہ میرے تن و توش، مخلص ہوش، روسی جوش کو دیکھ کر تھوڑا ڈر گیا اور رل لکنت سے بولا ـــــ مجھے نہیں معلوم . . . .

اور اپنے اس لطیفے پہ میں خود ہی اتنا ہنسا کہ آس پاس کے لوگ بھی ہنسنے لگے . . . . وہ مقولہ ٹھیک ہی تو ہے کہ ہنسو تو دنیا تمھارے ساتھ ہنسے گی، روؤ تو ـــــ پھر بھی وہ ہنسے گی!

چونکہ اس خنزیرہ کو پتہ چل چکا تھا کہ میں روسی کانسلیٹ میں کام کرتا ہوں، اس لئے اس نے سیدھے ہی روسیوں کی برائی شروع کردی۔ مجھے بڑا تاؤ آیا، باقر بھائی . . . . کوئی تمھاری تائی کو کچھی گالی دے یہ جانتے ہوئے کہ تم میرے جگری دوست ہو تو بتاؤ وہ گالی تمھیں لگے گی یا مجھے؟ میں نے چشمہ اتار کر میز پر پٹخ دیا اور سی۔ آئی۔ اے کو گالی دی۔ وہ کے۔ جی۔ بی کو بیچ میں لے آیا اور میرے چشمے کا جواب اپنے چشمے سے دیا۔ میں نے خالص پرولتاری انداز سے جوتا اتار کر میز پر مارا۔ اس سے دونوں چشمے میز پر یوں اچھلے جیسے وہ مرغ ہیں اور آپس میں لڑ رہے ہیں . . . .

میں نے روزن برگ کے مار دیئے جانے کی بات کی۔ میرا بس چلتا تو اس سلسلے میں فیض کی غزل

کی عزت اس کے منہ پر دے مارتا... وہ سالا سکھاروف اور سولڈنس پر چلا آیا اور اس کی گلاگ آرکی پیلیگو سے حوالے دینے لگا... اس موٹے تازے کتے کی بات کرنے لگا جو فرانس میں اس لئے چلا آیا تھا کہ اس کے اپنے ملک میں کھانے کو تو بہت دیتے ہیں، مگر بھونکنے نہیں دیتے۔

اب ہماری آوازیں اونچی ہو کر ارد گرد کی سب آوازوں کو بونا کئے دے رہی تھیں۔ ارے ارے اے لی لسن... سب بیکار ہو گیا تھا، یہ کیا مچھلی منڈی ہے؟... ایسے میں یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ برابر کی میز پر بیٹھی ہوئی لڑکی اپنی جملہ محبت کو ہونٹوں تک لائے اور اپنے پیارے سے پوچھ سکے کب ملو گے، جان کہاں ملو گے؟

معلوم ہو رہا تھا کہ ہماری وجہ سے وہ کبھی، کہیں کبھی نہیں مل سکتے۔

تم بات کرتے ہو — ؟ میں نے چلا کر کہا۔ جس کی تہذیب ہی جمعہ جمعہ چار سو سال پرانی ہے۔ جو کبھی مہیش، یوگی کا سہارا لیتا ہے اور کبھی پربھوپادکی دم سونگھتا ہے... ہرے رام، ہرے کرشن کے بچے؟

ڈکیومس کے نطفے...

اور ہم دونوں بیک وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور گرج گرج کر باتیں کرنے لگے ـــــ تم ہندوستانی جاہل ہوتے ہو، بدتمیز ہوتے ہو۔ اس نے کہا ـــــ دروازہ کھٹکھٹائے بغیر تو کمرے میں چلے آتے ہو" میں نے اسی پاٹ دار آواز میں کہا" ہندوستانی تو ہوگا تیرا باپ۔ تو جب اس دنیا میں آیا تو کوئی کبھی دروازہ کھٹکھٹایا؟"

اب تک ہم دونوں مکمل طور پر روسی اور امریکن ہو چکے تھے معلوم ہوتا تھا کہ کہیں ہاٹ لائن پر سے آواز آ رہی ہے۔ روکو روکو۔ لیکن ہم دونوں اس بات کے لئے تیار تھے کہ بٹن دبا ئیو۔ اور دونوں ملکوں کے آئی۔ سی۔ بی۔ ایم چھوڑ کر نیویارک اور ماسکو کو تباہ کر دیں اسلام آباد اور نئی دہلی کا پھر دیکھا جائے گا...

پہلے میز الٹا، پھر کرسیاں گریں۔ ان کے بیچ میں سے ہوتا ہوا لٹل ہٹ کا منیجر ہم تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عورتوں کے سال والی ایک عورت بے ہوش ہو گئی، سالی۔ کچھ لوگ موقع کا فائدہ اٹھا کر باہر بھاگ گئے، اور بل ادا کرنے کے عذاب سے چھوٹے۔ یہی نہیں کچھ لوگ دہشت کے عالم میں اندر گھس آئے۔ مریانا ونگ میں آدھی اندر آدھی باہر دکھائی دے رہی تھی۔ چشموں کی غیر موجودگی میں صرف اتنا ہی نظر آ رہا تھا کہ کالا گاؤن پہنے ہوئے ہے۔ اس سالے اسسٹنٹ نے مجھے ٹائی سے پکڑ رکھا تھا مگر

اس کے ہاتھ کانپتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے میں نے اس کی لش شرٹ کے کالر کو اتنے زور سے مروڑا کہ اس کا گلا گھٹ گیا۔ اس کی آنکھیں باہر چلی آئی تھیں۔ باہر تو زبان بھی چلی آئی تھی مگر تھوڑی سی —

اب جس زبان سے گالی دے رہا تھا، وہ کسی ملک کی نہ تھی۔ یہ وہی آواز تھی جو زبان کی ایجاد سے صدیوں پہلے انسان غاروں میں بولا کرتا تھا — یا ہو سکتا ہے وہ کوئی فری میسنری ہو، کوئی اسپرانٹو۔ نہیں اب مجھے یاد آرہا ہے۔ گُرگُر گو گو کلان تھی! ایک بات طے ہے کہ اس کا نغمہ اب ہندوستانی بھی نہ رہا تھا......

پھر ہندوستانی فلم کی طرح سے جانے کہاں سے گلدان اس کے ہاتھ میں آگیا۔ اور اس نے میرے سر پہ دے مارا۔ اگر ہمارے فلم ساز امریکی فلموں کی نقل نہ کرتے تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا۔ میں چکرا گیا۔ جبھی ایک چیخ سی آئی "گیٹ آؤٹ — ول یو وود — اور ہال کے ایک طرف کی بتیاں بجھ گئیں۔ سپاٹ لائٹ ہمیں پر تھی۔ جیسے کہ تھیٹر میں مرکزی کرداروں پر ہوتی ہے۔

دیکھا نہیں، اس نے پاس آتے، پورا بازو باہر کے دروازے کی طرف پھیلاتے ہوئے کہا "رائٹس آف ایڈمیشن ریزروڈ۔" پاس کے کسی ستم ظریف نے اس تحریر کی طرف دیکھا جو دروازے کے باہر لکھی ہوئی تھی اور اس طرف سے الٹی پڑھی جا رہی تھی۔ اسے پہلے حرف ڈی دکھائی دیا ریزروڈ کا اور وہ بولا — ڈی فارڈیول ای فار ایول...... لیکن منیجر کڑکا — "آپ باہر نکلتے ہیں یا میں پولیس کو بلواؤں؟"

اب سچی بات ہے، باقر بھائی، روسی ہونے کے باوجود میں تھوڑا ڈر گیا۔ ہاں اس جانبداری سے مجھے لینن پرائز تو کیا نہرو ایوارڈ بھی نہیں ملنے والا تھا۔ پولیس کی دھمکی دیتے ہی منیجر بیروں کی مدد سے خود ہی پولیس ہو گیا۔ ہم نے میز کے نیچے ہاتھ مار کر چشمے ٹٹولے، اٹھاتے اور لڑتے بھڑتے باہر کی طرف لڑھکے، وہ سالا امریکی مجھ سے پہلے نکل گیا تھا ورنہ میں تو اس کے ساتویں بیڑے کا بحر الہند بحیرۂ عرب تک پیچھا کرتا — حالانکہ ہال بجھی ہوئی بتیوں کے بحیرۂ اسود سے یہ سب کتنا بڑا فاصلہ تھا!

لٹل ہٹ کے باہر آیا تو کوئی دھندلی سی سفید چیز جیسے اڑتی ہوئی دکھائی دی — غالباً وہ اس امریکی بچے کی گاڑی ہوگی۔ میں نے صرف آواز سنی — "جلدی شوفر، جلدی....."

اپنے سسٹم سے بدلہ نہ نکال سکنے کی وجہ سے میں ابھی تک ہانپ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا، ایسے ہی مجھ سے کوئی تکرار شروع کر دے تو میں اسے بتاؤں ہ جیسے اندر کی جارحیت کو خارج کرنے کے لئے لوگ ردیت کی بوریاں ٹانگ کر اس پر مکّے مارتے ہیں۔ خواب میں بھیڑیئے کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اسے پھاڑ کر ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی میں..... مگر کوئی ماں کا لال سامنے نہ آیا اور اندازے سے بس اسٹینڈ کی طرف مڑا چشمہ لگایا تو سامنے ایک چابی لگی، کھلونا سی بس مجھے اسٹینڈ کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ ارے! باقر

بھائی ہمارے چشمے بدل گئے تھے۔ اس جھگڑے فضیحتے میں وہ میرا چشمہ لے گیا تھا اور اس کا میرے ہاتھ میں آگیا۔ فریم قریب قریب ایک ہی سے تھے یا ہمیں ایسے لگ رہے تھے۔

اس وقت گیارہ بجے تھے رات کے، جو میں نے یونیورسٹی کے گھڑیال میں کانوں سے دیکھے اور آنکھوں سے سنے.....

میرا پہلا تجربہ بس کا تھا۔ اس چشمے کے ساتھ ____

کچھ بھی نہ دکھائی دینے سے کچھ دکھائی دینا اچھا ہی تھا۔ چنانچہ میں نے وہ چشمہ پہنے رکھا۔ لیکن جب میں بس میں بیٹھنے کے لئے آگے بڑھا تو یوں لگا جیسے اتنے تنگ دروازے سے میں اندر کیسے جاؤں گا؟ لیکن اپنے بدن کو سیکڑ کر میں نے ڈیک پر قدم رکھا ہی تھا تو دیکھا کہ کوئی بچہ بس پر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے چنانچہ میں نے اپنا پاؤں پیچھے ہٹا لیا۔ ایسے ہی بچے نے بھی کیا۔ شاید وہ میری بزرگی کا احترام کر رہا تھا۔ میں نے پھر قدم بڑھایا تو اس بچے نے بھی ساتھ بڑھا دیا اور میں نے پھر کھینچ لیا۔ جبھی بس کنڈکٹر کی آواز آئی "صاحب، دارو پئے لا کیا؟..... اور اس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے بس کے اندر گھسیٹ لیا اور اور سیٹ پر جا بٹھایا۔ جب مجھے پتہ چلا کہ وہ پاؤں بچے کا نہیں، میرا اپنا ہی تھا۔

بس کنڈکٹر کی آواز آئی۔ "دیکھو..... کوئی لفڑا نہیں کرنے کا، آں؟" ___ وہ اب تک مجھے پئے ہوئے سمجھتا تھا۔ میں نے کہا" میں نے پی نہیں، کنڈکٹر تھوڑی سی پی ہے ___ مگر میری نظر کمزور ہے۔"

تو پھر چشمہ کاہے کو رکھا؟ وہ بولا۔

اب میں کہاں اتنی لمبی راون کہانی دہراتا۔ میں نے صرف اتنا کہا ___ ورلی ناکہ آجائے تو مجھے اتار دینا....

"ہو" اس نے کہا۔ پیسے لئے ٹکٹ دیا اور دوسری سواریوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سیٹ پر بیٹھتے ہی میں نے اپنا چشمہ اتار لیا دیکھو، میں پھر اسے اپنا ہی کہے جا رہا ہوں۔ عادت نہیں چھوٹتی نا۔ اس کے بغیر جیسے مجھے ہمیشہ لگتا تھا، آج بھی ویسے ہی لگا کہ بس کھڑی ہے اور سڑک کی اردگرد پنیاں اپنے گرد بے شمار کرنیں اور ہالے لئے نصف دائرے میں گھوم رہی ہیں۔ اور بڑے بڑے دھبے، نیلے پیلے، اودے کالے جو نظر آتے ہیں، نئی اور پرانی بلڈنگیں ہیں۔

پھر اضطرار، محض اضطرار کی وجہ سے میں نے پھر چشمہ پہن لیا میرے ساتھ کی سیٹ پر ایک بڑی پیاری، دلاری سی بچی بیٹھی ہوئی تھی۔ جب مجھ میں پیار اُمڈتا ہے نا، باقر بھائی، تو میں اس کی باڑھ کو روک ہی نہیں سکتا میں کبھی ہم آغوش ریچھ کی طرح سے کرتا ہوں.....

میں اس بچی کے گالوں پر چٹکی لینے ہی والا تھا کہ فوراً مجھے کچھ یاد آگیا اور میں نے اپنا اُمڈتا ہوا پیار، اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ٹھیک ہی کیا میں نے کیوں کہ اگلے اسٹاپ پر جب بس رکی اور بچی اترنے کے لئے اٹھی تو میں نے اپنا چشمہ اتار کر دیکھا۔ جو خاکہ میرے پاس سے گذرا وہ ایک جوان اور بھرپور عورت کا تھا اس کا سامنا! معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے آپ سے ایک فٹ آگے چل رہی ہے۔ میں اپنی اضطراری عقل سے بچا، باقر بھائی، نہیں تو اس رات میں پٹ گیا تھا!

مزے سے بیٹھا میں یاد کے منھ میں اس خوبانی کو پپول ہی رہا تھا کہ بس کنڈکٹر کی آواز آئی۔ "ارے ارے... مشٹیک ہوگیا، سالا... ورنی ناکا تو تین اسٹاپ ادھر رہ گیا۔ اب ہم پر بھادیوی کے بیچ ہوتا۔

"کنڈکٹر جی" میں غصے سے اتنا ہی کہہ سکا۔

اترو، اترو... لوکر... وہ بولا، سامنے اسٹاپ ہوتا الٹا بس پکڑ کر آگیا تو الٹا ہیا سے کا پیسہ دینے کو پڑیں گا....

جیسے کنڈکٹر نے میرا ہاتھ پکڑ کر بس پر بٹھایا تھا، ایسے ہی پکڑ کر نکال بھی دیا۔ بس چل دینے کے بعد مجھے گالی یاد آئی۔ ایسا ہوتا ہے نا باقر بھائی؟ میں گھر کیسے پہنچا، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ اپنے گھر کی بجائے دوسرے گھر میں غلطی سے گھس جانے کی جو خوشی ہوتی ہے مجھے تو وہ کبھی نہ ہوئی۔ گھر پہنچ کر پاؤں کو آنکھیں بنا کر سیڑھیاں چڑھا۔ جس دروازے کو میں اپنا سمجھا تھا، وہ اپنا ہی نکل آیا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں سیدھے کرسی پہ جا بیٹھا۔ تم تو جانتے ہو۔ اندھے کو بھی اپنے گھر کے سب موڑ توڑ پتہ ہوتے ہیں۔ بیوی کو بات بتائی تو اس نے اس امریکن کو بہت گالیاں دیں۔ لیکن مجھے یوں لگا جیسے تصور میں اسے پھولوں کی چھڑی سے مار رہی ہے، کیوں کہ عورت کی گالی میں وہ بات کہاں ہوتی ہے جو مرد کی گالی میں ہوتی ہے۔

اس رات اور تو کچھ نہیں ہوا، باقر بھائی۔ میں نے عادت سے مجبور پھر چشمہ آنکھوں پر رکھ لیا۔ جیسے ہی مڑ کے دیکھا تو ایک بڑی پیاری، دلاری سی گڑیا باہر جاتے اندر آتے دکھائی دی۔ ہے بھگوان! وہ میری ہی بیوی تھی؟! تم جانتے ہو نا باقر بھائی، للتا ایک عام روسی عورت کی طرح سے موٹی تازی

ہے۔ اس کی کمر کو ہے، لیکن اب ۔۔۔۔ یہ سالے امریکی کیا پلک جھپکتے میں سنٹر ملی میٹر سے آٹھ ملی میٹر کا پرنٹ بنا لیتے ہیں! میں نے بانہہ پسار کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ جانے کب سے پیار کے لئے ترسی ہوئی، اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔ وہ مزاحمت بھی جو عورتیں بہت دیر تک پیار نہ کئے جانے کے غصے میں کرتی ہیں۔ شاید اس نے سوچا کہ انکار کیا تو یہ موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا ـــــ یہی نہیں ـــــ الٹا شاید عورتوں کا سال منانے کے سلسلے میں اس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا اور دھیرے دھیرے ۔۔۔ اسے معلوم ہونے لگا کہ کوئی چیز اس کے پیار کے راستے میں آرہی ہے۔ اور جلدی ہی اسے پتہ چل گیا۔ وہ بولی ـــــ "تم چشمہ کیوں نہیں اتارتے؟" میں نے ایک دم اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیا ـــــ خبردار!

اتوار کے دن ساؤتھ بمبئی بند ہوتا ہے۔ مگر نارتھ۔ دادر، باندرہ کا علاقہ کھلا رہتا ہے۔ آدمی چاہے تو ارجنٹ آرڈر دے کر دوسرا چشمہ بنوا سکتا ہے، لیکن انسان کو اتنی سادہ سی حقیقت بھی کون سمجھائے کہ چشمے تک پہنچنے کے لئے بھی چشمہ چاہیے۔

میرا اتوار جیسے گذرا، اس سے تو شکر (جمعہ) ہی ہزار درجے اچھا تھا۔ وہی تمھاری بات کہہ گئے تھے روزے بخشوانے، الٹا نماز گلے پڑی! اور پھر آپ سے دھریئے، سنیچر اور اس کے کوپ کو بھی تو نہیں مانتے کوئی ماننے بھی تو اس کا کیریکٹر شیٹ خراب کر دیتے ہیں۔

آدھا دن تو میرا یہی بات سوچنے میں گذر گیا کہ اس کارڈ انڈکس کا دن کیسے گذرا ہوگا! انڈکس کی نوب ڈھونڈنے کے لئے بھی تو چشمے کی ضرورت پڑتی ہے اور اگر وہ نوب اسے ہڈسن کا وصل معلوم ہونے لگے تو وہ اپنا ہاتھ کھینچ لے گا۔ جانے اسے کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہوگا؟ ہو سکتا ہے اس کے پاس سپیئر چشمہ ہو، کیوں کہ وہ امیر آدمی ہے۔ مگر اگلے روز پتہ چلا کہ اس کے پاس سپیئر تھا لیکن چند ہی دن پہلے اس ہاتھی کے انڈے نے اپنا ہی پاؤں اپنے سپیئر پہ رکھ دیا اور وہ کرنچ ہو گیا۔

دوسرا وہ بنوا نہ سکتا تھا، کیوں کہ اس کا آپٹیشین بھی ساؤتھ بمبئی ہی میں تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ غلطی کا پتہ چلتے ہی وہ لٹل ہٹ پہ لوٹ کے آیا کہ شاید مجھے میری غلطی کا پتہ چل چکا ہو۔ اگر دو غلطیاں مل کر ایک ٹھیک نہیں ہو سکتیں تو ایک غلطی دوسرے کے ساتھ تبادلے میں تو ٹھیک ہو سکتی ہے میں نے تو خیر اس لئے بھی پرواہ نہ کی، کیوں کہ اس چشمے میں مجھے اپنی غلطی بہت چھوٹی معلوم ہو رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ اسے پتہ چلے کہ اس کی غلطی کتنی بڑی ہے!

منیجر سے منت کر کے مبادا کے انداز میں اس نے لٹل ہٹ میں جھانکا وہاں سب کچھ عظیم الشان تھا، لیکن میں نہیں تھا، اگر میں ہوتا تو انسان کی انا کی طرح سے جن دکھائی دیتا اور وہ بے ہوش ہو کر گر جاتا

لٹل ہٹ میں سے مریانا کی آواز، صرف آواز آرہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ گا رہی ہے۔

تم میرا چشمہ لے آؤ، اچھا کیا، اچھا کیا....

اندر راس کارڈ اینڈ کس، اس کمپیوٹر کو کچھ گلابی، کچھ گہرے دھبے سے دکھائی دیئے اور پھر ایک کالا دھبہ جو مسلسل ہل رہا تھا۔

اس نے بھی اضطرار میں چشمہ لگایا تو ایک دم الٹا بھاگ نکلا، کیوں کہ وہاں لٹل ہٹ، میں وہ کوئی ایلینیں لے آئے تھے اور وہ ناچ بھی رہی تھی!

تھی وہ مریانا... میرے چشمے کا مہربانا!

اپنے خوف، اپنی جھلاہٹ میں اسی مبادا کے انداز میں وہ اپنے آپٹیشن کا پڑیا کی دکان کے سامنے سے بھی گذر گیا کہ شاید دکان کی چمک میں سے کوئی روشنی کی کرن نظر آجائے۔ لیکن کاپڑیا کی دوکان اور بھی بند دکھائی دے رہی تھی۔ ایک تو اس لئے کہ وہ واقعی بند تھی دوسرے اس لئے کہ وہ اسے دکھائی نہ دے رہی تھی۔

اس مسلسل حماقت سے اسے یوں لگا کہ وہ ایسی گلی در ہے جو جنات کے ملک میں پہنچ گیا ہے۔ جہاں سب لوگ مل کر اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ڈرا سہما ہوا وہ امریکی ہندوستانی گھر پہنچا۔ شوفر اور گاڑی کی وجہ سے گھر پہنچنے میں اسے کوئی زیادہ دقت نہ ہوئی۔ ہوئی بھی تو صرف اتنی کہ وی۔ ٹی۔ کا اسٹیشن، کارپوریشن کی عمارت میں ایسا کے زلزلے میں اسے اپنے آپ پر گرتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ گھر کے بلند شہری دروازے کے اندر پہنچ کر، جب اس نے سیڑھی پہ قدم رکھا تو لڑکھڑا کر گرا کیوں کہ جسے وہ تیسری سیڑھی سمجھا تھا، وہ ابھی پہلی ہی تھی۔ اسے چوٹ بھی آئی مگر زیادہ نہیں ـــــ

گھر کے اندر پہنچا تو اسے ایک گدھا چھلانگیں مارتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے بہت تاؤ آیا۔ کیوں کہ وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ گدھا بھی پالتو جانوروں میں سے ہو سکتا ہے۔ آخر اس کی بیٹی جوری آئی اور اس نے بتایا کہ بیک یارڈ میں جو دھوبی رہتے ہیں نا پپا۔ انھوں نے مجھے خرگوش دیا ہے۔

میں نے اس رات بیوی سے پیار کیا تھا نا باقر بھائی، لیکن اس کارڈ اینڈ کس اور کمپیوٹر کی اپنی بیوی سے لڑائی ہو گئی۔ اس لئے کہ بیوی اسے اپنی طرف آتا ہوا وجینتا ئینک دکھائی دینے لگی تھی۔ اور جب بچنے کے لئے اس نے دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو اس کا سر پھٹ گیا کیوں کہ جسے اس نے دروازہ سمجھا وہ دراصل کھڑکی تھی!

سوموار کی صبح جب میں نو ساڑھے نو بجے اپنے اندازے کے مطابق سمی لٹل ہٹ کے باہر پہنچا تو وہ چشمہ میرا انتظار کر رہا تھا، اپنی بچگاڑی میں... میں امن کے انداز میں آگے بڑھا وہ جنگ کے خوف سے پیچھے ہٹ گیا لیکن

تھوڑی دیر میں سمجھ کے اوپر آجانے سے ہم دونوں نے چشمے اتارے اور دو بھوتوں کی طرح سے ایک دوسرے پر بڑھے، کچھ کہا سنا، چشمے بدلے۔ اب ہم ایک دوسرے سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ معاف کیجئے، چھما کیجئے، کے سے جملے دہرا رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا میرا قصور ہے۔ میں کہہ رہا تھا میرا دوش۔ ہم نے خود کو گالیاں دینا شروع کردیں گویا اس آدھی رات اور سوا دن میں ہم پورے ہندوستانی ہوچکے تھے ——— ☐

ابن فرید

"چشمۂ بد دور" کے محدّب شیشے

میں مطلب کی پرواہ ہی نہیں کرتا اور اگر کرتا بھی ہوں تو بہت بعد میں۔ میں لوگوں کو کہانی کے بارے میں لے دے کرنے دیتا ہوں، ناسمجھی کے الزام سے ڈرتے ہوئے وہ خود ہی اس میں معنی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جب میں بے اختیار ان کی داد دیتا ہوں اور ان کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہہ اٹھتا ہوں: بالکل، میرا بھی یہی مطلب تھا۔ مگر افسوس ذہانت کے اس ویران آباد ملک ہندوستان میں سمجھنے والے کتنے لوگ ہیں؟ دراصل کہانی ہر ایک کے لئے لکھی بھی نہیں جاتی یارو! میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک آدمی بھی سمجھ گیا تو میری محنت ٹھکانے لگی..... جیو.....

(ہاتھ ہمارے قلم ہوئے)

بیدی جی، تم کو شاید اپنی یہ کہانی اسی لئے پسند ہے کہ تم نے اسے اپنے قارئین کے اس حلقہ کے لئے لکھا ہے جو بہت محدود ہے اور تم چاہتے ہو کہ ان میں سے کوئی تو اپنی ذہانت کا ثبوت دے، کوئی تو اسے سمجھے اور تمھاری محنت ٹھکانے لگے۔ چنانچہ پہلے جب تم نے اسے لکھا تو اس میں بہت سی تفصیلیں تھیں۔ پھر تم نے سوچا کہ کہانی پڑھنے والے تک پہنچ گئی، اس لئے اب تم اسے بھول جاؤ، لیکن راہو سوم (چندرما) کا پیچھا کرتا رہا اور تم پاپ گرہ سے نہ نکل سکے اور کہانی ایک بار پھر فراموش گاری کے گرہن سے نکل کر تمھارے فنکارانہ ذہن کے نیلبر پر جگمگانے اور مسکرانے لگی، اور جیسا کہ تم نے اب سے پونے پانچ سال پہلے کہا تھا:

> افسانہ ایک شعور، ایک احساس ہے، جو کسی میں پیدا نہیں کیا جا سکتا، اسے محنت سے حاصل تو کیا جا سکتا ہے، لیکن حاصل کرنے کے بعد بھی آدمی دست بہ دعا ہی رہتا ہے۔ کچھ راز تو ہضم کی وجہ سے بھی اس میں آجاتی ہیں اور کچھ کسی اور ذہنی فتور سے ــــ تسکین کی بات صرف اتنی ہے افسانہ ابھی ہمارے ہاتھ سے نکل کر ایڈیٹر کے ہاتھ نہیں پہنچا ہم اس میں ازدیاد و اضافہ کر سکتے ہیں اور اس پر بات دبنے تو پھاڑ کر پھینک سکتے ہیں۔

(افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل)

لیکن بیدی جی ، تم نے "چشمۂ بد دور" کو پھاڑ کر نہیں پھینکا۔ اور تم اس کے ایڈیٹر کے ہاتھ میں پہنچنے کے بعد بے بس ہوئے۔ اس کا بہت سا بس اس کے شنکر کے حلقوم میں نیل کنٹھ بن گیا۔ اور تم نے اپنے برش قلم کے ایک وارسے دیوتا کا روپ دھارے ہوئے راہو کیتو کے سر کو دھڑ سے الگ کر دیا۔ کہانی کا چندرما ایک بار پھر تمہارے سدرشن چکر کے ذریعہ تابناک ہو گیا۔ تم شُکر (اچاریہ) ہو یا برہسپت (گرو) ؟ یا روی (سوریہ) ہو ؟ لیکن سوریہ تم یقیناً نہیں ہو ورنہ راہو تمہیں بھی نگل جانے کی کوشش کرتا ــــ [شاید ستیہ یگ میں نہ کرتا ہو لیکن کل یگ میں تو کرتا ہی ہے] ــــ خیر، تم نے کہانی کو پھر سنوارا اور سینے سے لگائے دلی پہنچے۔ تمہیں سمجھنے والے لوگوں کی تلاش تھی، تم نے اسے محفل محفل سنوایا۔ کچھ لوگ یقیناً اس کا تاثر لے کر گھروں کو رخصت ہوئے ہوں گے۔

یہ واقعہ بھی سنیچر ہی کے روز ہوا تھا۔

تم کہو گے کہ تمہارے ساتھ سب واقعات سنیچر ہی کے روز کیوں ہوتے ہیں ؟

تو بولو، میں کیا جواب دوں ؟

لیکن اس کا جواب تم کو اس سوال سے پہلے ہی دے دیا گیا تھا ؛

میری جنم کنڈلی دکھائی گئی

جوتشی نے کہا :

یہ لگن میں کیتی ہے۔ برہسپت اپنے گھر کا ہے اور بدھ پر نظریں ڈالتا ہے۔ یہ بچہ ایک بڑا فن کار بنے گا، لیکن شنی کی نظریں بھی ہیں، اس لئے نام اور شہرت مرنے کے بعد ہی حاصل ہو گی۔ سوریہ طلوع ہو رہا ہے۔ دولت کے خانے میں شُکر ہے جسے سورج نے اپنی تیز روشنی سے ماند کر دیا ہے۔ چوں کہ شنی شُکر کو دیکھتا ہے، اس کی زندگی میں بیسوں عورتیں آئیں گی۔ شنی اور شُکر کا یہ میل شاید اسے کوٹھوں پر بھی لے جائے لیکن برہسپت کے خانے کے سبب کبھی اس کو بدنامی نہ ہو گی۔ اس کے علاوہ منگل کبھی سنیچر کے ساتھ پڑتا ہے حالانکہ دونوں ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں لیکن منگل پھر منگل ہے، اثر تو ہو گا ہی، کام چلتے چلتے ایک دم سے رک جائے گا۔ دسویں گھر میں راہو ہے جسے منگل دیکھ رہا ہے، اس کی بیوی بیمار رہے گی، گویا میرے باپ کی بیوی بیمار، دائم المریض، اور میری بیوی بھی، شاید پورے خاندان کو بد دعا لگی تھی۔

(آپ بیتی)

کیا بتاؤں دوست ؟

جب دسویں گھر میں راہو ہوگا تو شنی کا بردان اور کیا ہوگا ! اس کا تعلق ہی ہر کالی چیز سے ہے چنانچہ میرا ایسا واقعہ جو خیر کے بجائے شر، نیک کے بجائے بد انجام تک پہنچائے دیوتا نما راکشش کی پرستش کے دن ہی ہوگا۔ معلوم نہیں وہ کون بھیڑیا ہے جو سنیچر کی پوجا کرتا ہے ؛

ڈبل کنو یکس والا ؛

ڈبل کان کیو والا ؛

لیکن یہ دونوں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔

دونوں چشمے میز پر یوں اچھلے جیسے وہ مرغ ہیں اور آپس میں لڑ رہے ہیں۔

لیکن میں نے بات کہاں سے شروع کر دی۔

فی زمانہ ایک بات اور دوسری بات میں ربط رکھنا مشکل ہے۔ ہمارے سب شاعر اور ادیب اس کے گواہ ہیں۔ پر وہ بھی کیا کریں، مہنگائی بھی تو اتنی بڑھ گئی ہے۔

لیکن یہ معذرت تم نے اپنے لئے تو پیش کی نہیں ہے بیدی جی ! تم تو بہت پہلے کہہ چکے ہو :

..... افسانے کا فن زیادہ ریاضت اور ڈسپلن مانگتا ہے.... افسانے میں جزو کل کو ایک ساتھ رکھ کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ اس کا ہراول، متداول اور آخری دستہ مل کر نہ بڑھیں تو یہ جنگ جیتی نہیں جا سکتی۔

(افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل)

اس لئے مجھے بھی اس افسانہ کو تمہاری اسی شرط کے ساتھ پڑھنا چاہئے۔ لیکن میں کیا کروں کہ تم نے اس کا عنوان ہی "چشمِ بد دور" رکھا ہے۔ ہر بار جب افسانے کو پڑھنا شروع کیا جاتا ہے تو محدب شیشے نظر کو اس رنگ میں رنگ دیتے ہیں جو تم قاری کی آنکھوں پر چڑھانا چاہتے ہو، اور یہی تمہاری کہانی کا مرکزی وقوعہ ہے۔

یہ بھی تو ایک بدشگونی ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے معذور ہو جائیں اور جب دیکھنا چاہیں تو دوسروں سے بصیرت مستعار لینی پڑے۔ ہمیں اپنی آنکھوں سے نظر کیا آتا ہے ؟ بڑے بڑے دھبے، نیلے پیلے، اودے کالے ! اور ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اپنی نظر کی درستی کے لئے چشمہ کا سہارا لیں ــــــ ڈبل کنو یکس / ڈبل کان کیو ــــــ اور یہ چشمے ہمیں دو مختلف بصیرتیں عطا کر دیتے ہیں، اور ہم گھر سے لے کر باہر تک انھیں محدب شیشوں کے ذریعہ دیکھنے لگتے ہیں۔

وہ بولی ــــــ "تم چشمہ کیوں نہیں اتارتے ؟"

میں نے ایک دم اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیا ـــ" خبردار !"

گویا یہ رنگین بصیرت ہمیں اتنی عزیز ہوتی ہے کہ اپنی قریب ترین ہستی کا تقاضا بھی ہمیں ناگوار گزرتا ہے۔ ہماری دریوزہ گری اور طفیلی روش ہماری زندگی کے ہر گوشہ پر محیط ہو جاتی ہے اور ہم وہی دیکھنا چاہتے ہیں جو ہمارے شیشوں کے بیچ سے ہمیں دکھائی دیتا ہے۔

ہم چاہتے تو ہیں کہ دوسروں (باقر بھائی) سے بات کریں، لیکن وہ دوسرا بھی افسانہ بن جاتا ہے۔ اور ہماری ساری روداد خود کلامی بن جاتی ہے۔ ہمارے ذہنوں میں ماضی سے وابستگی سسکتی رہتی ہے، ہماری مادی زندگی کی بے روح ہما ہمی، ہمیں اپنی روحانی زندگی کی طرف متوجہ کرتی ہے، لیکن اس کے متوازی، ہمیں شنی دیوتا نظر آتا ہے، پاپ گرہ ملتا ہے، راہو پیچھا کرتا ہے، اس لئے کہ سوم (چندرما) نے وشنو کو بتایا تھا کہ یہ دیوتا نہیں ہے، بہروپیا ہے، راکشش ہے، اور اب جب بھی موقع ملتا ہے وہ چندرما سے بدلا لینے کے لئے اس کا پیچھا کرتا ہے، اور تم یہ جو ڈبل کنویکس چشمہ لگائے ہو یہ تمہارا مکھوٹا (PERSONA) ہے، اور تمہارے دسویں گرہ میں راہو ہے، اور تمہارے اول روز سے تمہارا پیچھا کرتا رہا ہے، تم اس کے خوف سے اب تک خود کو آزاد نہیں کر سکے ہو، یہ تمہارے لئے کابوس بن گیا ہے، جس سے نجات پانے کے لئے تم نے اسے رشوت دی تھی افسانہ "گرہن" لکھ کر!

سمندر کی ایک بڑی بھاری اچھال آئی۔ سب پھول، بتاشے، آم کی ٹہنیاں، گجرے اور جلتا ہوا مشک کافور بہا کر لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے عیب ترین گناہ بھی لیتی گئی ـــ دور، بہت دور، ایک نامعلوم، ناقابلِ عبور، ناقابلِ پیمائش سمندر کی طرف ـــ جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی ـــ پھر شنکھ بجنے لگی۔ اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر بھاگی ـــ سرپٹ، بگٹٹ، وہ گرتی تھی، بھاگتی تھی ـــ پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی، ہانپتی اور دوڑنے لگتی ـــ اس وقت آسمان پر چاند پورا گہنا چکا تھا ـــ راہو اور کیتو نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا تھا ـــ دو دھندلے سائے اس عورت کی مدد کے لئے سراسیمہ ادھر ادھر دوڑ رہے تھے ـــ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور دور اسارٹھی سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔

"دان کا وقت ہے ـــ"

"چھوڑ دو ـــ چھوڑ دو ـــ چھوڑ دو ـــ"

ہر ہر پھول بندر سے آواز آئی ـــ

"پکڑ لو ـــ پکڑ لو ـــ پکڑ لو ـــ"

....

....

"چھوڑ دو ـــــ وان کا وقت ہے ـــــ پکڑلو ـــــ چھوڑ دو !!"

(گرہن)

اور وہ عورت جو کبھی اپنی آزادی کے لئے اپنے ماضی کی طرف (ساز/ا- دیوگرام = سیکے) بھاگنا چاہتی تھی تاکہ اس فرد سے جس نے اسے صدیوں روندا ہے، اسے نجات مل جائے اور زندگی کے سارے آلام کو الفرکل کے سمندر کی اچھال میں بہادے لیکن وہ بچے ماں کے امرت سے محروم ہو کر مندر سے باہر آنے والے ہر فرد کو گھیر لیتے ہیں خواہ اس کی جیب میں پیسہ بھی نہ ہو۔

ماں اور بچہ کا یہ رشتہ کہاں سے ٹوٹا تھا؟

جب ماں کی چھاتیوں میں دودھ نہ رہا۔ وہ مندر سے باہر آنے والے ہر بھگت کو اس کی بلندیوں سے اپنی پستیوں اور محرومیوں کا عبرتناک نظارہ کراتی رہی، لیکن ان کے انسانی احساسات میں کوئی تحریک نہ ہوئی۔ شاید پتھر کے صنم پوج کر وہ بھی پتھر کے ہو گئے تھے۔ پھر وہ عورت مریانا بن کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ سامنے اپنے دودھ پہ وہ سمرزم کے دو نقطے پینٹ کرلیتی ہے۔" اور اس کا لباس "مریانا ناچتے وقت اپنے بدن پر کبھی صرف انجیر کا پتہ پہنتی ہے۔"

> عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لئے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لئے خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اس نے کھایا○ تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انھوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لئے لنگیاں بنائیں○ اور انھوں نے خداوند عالم کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سنی اور آدم اور اس کی بیوی نے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا○

(عہد نامۂ عتیق۔ پیدائش۔ باب ۳ آیات ۶ تا ۸)

اور جب وہ دونوں [ڈبل کنزیکس اور ڈبل کان کیو] قابیل اور ہابیل کی طرح ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوئے تو "پہلے میز الٹا۔ پھر کرسیاں گریں، ان کے بیچ میں سے ہوتا ہوا اسٹل ہٹ کا منیجر ہم تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا" ــــ "مریانا ڈنگ میں آدھی اندر آدھی باہر دکھائی دے رہی تھی۔ جسموں کی غیر موجودگی میں صرف اتنا ہی نظر آرہا تھا کہ وہ کالا گاؤن پہنے ہوئے ہے۔"

اس نے کہا میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور میں ڈرا کیوں کہ میں ننگا تھا اور میں نے
اپنے آپ کو چھپایا۔

(عہد نامۂ عتیق۔ پیدائش۔ باب ۳۔ آیت ۱۰)

"جبھی ایک چیخ سی آئی "گٹ آؤٹ، وِل یو۔۔۔۔" "آپ باہر نکلتے ہیں یا میں پولیس کو بلواؤں؟"
"پولیس کی دھمکی دیتے ہی فیجر بیروں کی مدد سے خود ہی پولیس ہو گیا۔"

چنانچہ اس نے آدم کو نکال دیا اور باغِ عدن کے مشرق کی طرف کروبیوں کو اور چوگرد گھومنے
والی شعلہ زن تلوار کو رکھا کہ وہ زندگی کے درخت کی راہ کی حفاظت کریں۔

(عہد نامۂ عتیق۔ پیدائش۔ باب ۳۔ آیت ۲۴)

لیکن اس حکم سے پہلے وہ اس رہزنِ تمکین و ہوش پر بھی عتاب نازل کر چکا تھا:

پھر اس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھا دوں گا۔ تو درد کے ساتھ
بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہو گی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔

(عہد نامۂ عتیق۔ پیدائش۔ باب ۳۔ آیت ۱۶)

اس طرح ہر چند کہ وہ مریانا تھا کر دوارے کی دہلیز سے اٹھ کر ٹل ہٹ میں آ گئی لیکن وہاں بھی ہر مرد اس گمان میں مبتلا ہے کہ وہ صرف اسی کی طرف رغبت رکھتی ہے۔ اور لڑکیاں؟ "مگر ان کا مت پوچھو۔ وہ یا تو مریانا کی نظروں سے مردوں کو دیکھ رہی ہوں گی اور یا پھر سیدھے اس کے 'لباس' کو۔" شاید اس لئے کہ وہ کبھی "اپنے پیارے" سے یہ آس لگائے بیٹھی ہیں کہ ایک دن ان کے "جان" ان سے کہیں ملیں گے اور ان پر حکومت کریں گے اور حکومت کرنے کے لئے" اپنے منہ کے پسینے کی روٹی کھائیں گے، جب تک کہ وہ پھر اس زمین میں لوٹ نہ جائیں گے جس میں سے وہ نکالے گئے ہیں۔ (آیت ۱۹) چنانچہ مرد روز صبح سے شام کے چھ بجے تک (کبھی یہ چھ رات کے بارہ بجے بھی بج سکتے ہیں) فائلوں میں لعنتی بن کر ہل چلاتا ہے، دن کی سبزی اگاتا ہے لیکن یہ زمین عمر بھر اس کے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارے اگاتی رہتی ہے (آیت ۱۸) یہ اونٹ کٹارے اسے اپنے گھر میں نظر آتے ہیں۔

لتا ایک عام روسی عورت کی طرح سے موٹی تازی ہے، اس کی کمر کمرہ ہے۔

اور اس نے چوں کہ اس کے ہاتھ سے "عقل بخشنے والا پھل" کھایا ہے، اس لئے وہ ٹل ہٹ کی طرف بھاگتا ہے اور یہاں وہ اپنے تخیلہ سے محروم ہو جاتا ہے، اس کے اعضا میں نظر نہ آنے والی ڈوریاں بندھ جاتی ہیں اور وہ کسی اور کے اشاروں پر حرکت کرتا ہے۔ سب کچھ بدل جاتا ہے، لیکن مریانا:

کچھ دیر بعد مریانا اپنا 'لباس' — انجیر کا پتہ بدلنے کے لئے اندر چلی گئی تھی اور میں ہوش میں آنے کی بجائے جوش میں آ چکا تھا۔ فلاغیے میرے سامنے یوں کھل گئے جیسے میرا ذہن نزرالغات ہے۔

وہ اپنے ابتدائی ورودان؍شراب کی طرف رجعت کر جاتی ہے، اور مرد اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ ہوش میں آتا نہیں ہے بلکہ اور ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہاں بھی وہ جب دن بھر کی مشقت کے بعد واپس آتا ہے تو مریانا دستِ سوال دراز کرتی ہے۔ ڈیل کان کیوسے للتابھی ایک بڑی پیاری دلاری سی گڑیا نظر آتی ہے۔ یہ کیسا چشمہ ہے جس نے عائلی نظام کا آڈٹ لک ہی درہم برہم کر دیا ہے۔

تم میرے لئے کیا لائے ہو؟
آرگل کی جرابیں لائے ہو — اچھا کیا، اچھا کیا،
تم میرے لئے کیا لائے ہو؟
موز مبیقی موتیوں کی مالا لائے ہو — اچھا کیا، اچھا کیا،
مہارت کا عطر لائے ہو — اچھا کیا، اچھا کیا،
میں تو تمھارے لئے کچھ نہیں لائی جان!....
میرے پاس تو ایک دل ہے، جو صرف تمھارے ہی لئے دھڑکتا ہے....

اور پھر —

اچھا کیا، اچھا کیا —

لیکن اس دل کی رغبت (آیت ۱۶) اپنے منہ کے پسینے کی روٹی (آیت ۱۹) سے کسی طرح لاتعلق نہیں ہے۔ اس میں اس ٹھاکر دوار کا بھی حصہ ہے جس کا کائنات کے نمبر دو ستاروں سے تعلق ہے، اور جس کے یہاں "ہر کلائی بجنے پہ مقبول ہے" اور پھر ایک کالا دھبہ جو مسلسل بل رہا تھا، وہ مسمرزم کرتا ہے اور معاشرہ میں اقدار کا انقلاب آ جاتا ہے۔ مریانا پوچھتی ہے:

تم میرا چشمہ لے آئے ہو، اچھا کیا، اچھا کیا،

لیکن وہ مریانا نہیں تھی، وہ ہماری معذوری تھی جو ہمارے کانوں میں آواز بن کر گونج گئی، ہماری نجی زندگی بے حد روایتی اور از کارِ رفتہ ہونے کی وجہ سے ہمیں اپنے عصر میں وقار عطا نہیں کر پاتی، اس لئے ہم اپنے استحکام کے لئے باہر کی دنیا میں نکل کر آتے ہیں۔ مادی پیش رفت کے لئے ہم سہارے ڈھونڈتے ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ اور سماجی علائق بھی دبے پاؤں ہماری روزمرہ کی زندگی میں در آتے ہیں، جن کا نہ ہمیں احساس

ہو پاتا ہے اور نہ جن کو ہم کوئی خاص اہمیت دیتے ہیں۔ بلکہ وہ بجلی رنگ کی ٹائی کے نیچے نیکس بلیکس کے نقش جلوں اور دھندلی سی پوررو تصویروں کی طرح چھپے رہتے ہیں۔ ہم اپنے بیل بوٹم کے پائنچوں کے پھونسٹرے نکال کر بالکل عام انسانوں میں مل جانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایسا ممکن نہیں ہو پاتا۔ ٹل بٹ خواہ کسی بڑے ہوٹل کے میکروکازم میں مائیکروکازم ہو لیکن وہ اس اجنبی کائنات کا حصہ بہرحال ہے جس سے ہم امکانی حد تک مانوس ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ہماری اپنی اصل ہندوستانیت (اساسی معاشرتی، ثقافتی اقدار) کہیں نہ کہیں سے اپنا منہ باہر نکال ہی لیتی ہے: ٹل بٹ اس طرح ثقافتی گنجائش (ACCOMODATION) اور تطابق (ADAPTATION) کی علامت بن جاتا ہے۔

تم اپنے مونولوگ کے تصوری مخاطب کو سمجھانے لگتے ہو:

- تم جانو باتو بھائی، دنیا کے سب فساد عورت کی کمر ہی سے شروع ہوتے ہیں!
- میں نے تمھیں کہا تھا نا کہ عورت کے بارے میں ہر مرد کا ایک فیٹش، ایک خبط ہوتا ہے، چنانچہ میرا خبط اس کی کمر ہے۔
- وہ زیتون کے تیل کی مالش سے اپنے بدن کو اتنا چکدار بنا لیتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اوپر کے حصے کا نیچے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسے ہماری ٹرالی بسیں ہوتی ہیں نا جس میں ٹرالی پہ ڈرائیور رہتا ہے اور پیچھے سواریاں اور ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر الٹ جاتی ہیں۔

صنعتی معاشرہ سے یہ شبیہی زندگی کی تشبیہ بڑی برمحل ہے۔

- میرے دماغ میں مریانا کے بارے میں اپنے آپ ایک نظم چل رہی تھی
  مریانا، او مریانا، تیرے لئے آج، مر جانا......

تخیل اپنی ہی مانوس فضا میں پرواز کرتا ہے۔

- گوانی آرکسٹرا میں سے جھانجے والے نے زور زور سے جھانجے بجائے۔ پردے کے پیچھے سے بڑے کھرج والی پال رابسنی آواز آئی ـــــ مر..... یا..... نے ...!
  مجھے نہیں معلوم تھا کہ مریانا کو مریانے بھی کہہ سکتے ہیں، یا کہتے ہیں۔ میرے اندر جو نظم پیدا ہو رہی تھی، ایکا ایکی بدنظمی کا شکار ہو گئی۔ سب قافیے غلط ہو گئے میرے ہوش اڑ گئے!

یہ ٹل بٹ کیا ہے؟ ایک کتھا ہے جس میں شاطر زندگر پرانی دھات کو گلاتا ہے، نئے سانچے میں ڈھلنے

کے لئے، ایک کڑی ہے جو کسی ٹوٹتی ہوئی زنجیر کو نئے قبضے یا کنڈے سے جوڑ دیتی ہے، اور بیدی جی، تم اپنے کھونٹے یا پرسونا میں سے کہتے ہو کہ شادی کے تیسرے چوتھے سال جب مرد اپنے مجلا سردی کی یکسانیت (MONO-TONY) سے اکتا جاتا ہے تو وہ ٹل ہٹ کی طرف نکل آتا ہے، لیکن وہ یہیں کیوں آتا ہے پرسونا سے جی؟ — اس لئے کہ جب ہندوستان ابھی ایک غلام ملک تھا، اس کی حیثیت ایک خام منڈی کی تھی، تب:

جلال نے کلائی پر سے چسٹر کی آستین ہٹاتے وقت دیکھا۔ ساڑھے سات بجے تھے، اور سردیوں میں ساڑھے سات بجے اچھا خاصا اندھیرا ہو جاتا ہے۔ دھند نے سورج کے غروب ہوتے ہی تمام شہر کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا — اور بلیرڈ کلب میں جانے کا وقت تھا۔

بلیرڈ کلب، سموکنگ کلب، برِیل کلب یہ سب ایک ہی بات تھی۔ یہ سب مہذب مرد عورتوں کی تفریح گاہیں تھیں۔ جلال نے اپنی جیب ٹٹولی۔ پرسوں کی سویپ اور فلاش میں اس نے تہتر روپے جیتے تھے۔ جلال کو وہ کمبلی سی محسوس ہونے لگی جو ہر جیتے ہوئے کھلاڑی کو اور داؤں لگا کر سب کچھ گنوا دینے کے لئے اکساتی ہے۔ جلال ایک دم رک گیا چسٹر کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے فیصلہ کن اقرار و دعویٰ سے کہا کہ وہ یقیناً روپوں کو کسی بہتر کام میں صرف کرے گا۔ وہ اپنی بھولی بسری بیوی کے لئے گرم ساڑھی لائے گا یا اپنے بڑے بیٹے کے لئے جو ایک مقامی کالج میں ایف اے کا متعلم تھا ایک چھوٹی سی لائبریری خریدے گا۔ وہ نظارہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا جب کہ اس کے بیٹے نے نہایت اشتیاق سے کتابیں خرید کر لا دینے کی التجا میں انگلستان کے بڑے بڑے ناشروں کی فہرستوں پر نگاہیں ڈالے تھے۔

(ردِّ عمل)

پھر جب ہندوستان آزاد ہوا اور تیسری دنیا میں ترقی پذیر ملک کی طرح نمودار ہوا تو یہ خلیاتی (CELLULAR) مائیکرو کازم (بلیرڈ کلب، سموکنگ کلب، برِیل کلب) بڑے بڑے مائیکرو کازموں میں ضم ہو گئے۔ انگلستان پسِ پشت چلا گیا اور نئے تاجر — ڈبل کنونیکس / ڈبل کان کیو — نئی بصیرتوں کا سودا کرتے آ گئے۔ ٹرائی بسین: مریانا کی کمر — "مریانا کی بات چھوڑو، اس کی کمر تو صفیص الثنی ہے" — گوانی آرکسٹرا، بڑے کمرے والی پال رابسنی آواز، نیگرو اسپرچوئل اور بیچی ہرلیسنی میوزک، لیکن یہ کوئی درخل چیز "تھی جو اب بھی ہندوستانی نہ ہو سکی تھی۔ شاید اب بھی اتنی ہی اجنبی تھی جتنی کہ وہ تہذیب جو دراوڑوں سے بھی بہت پہلے جزیرہ نمائے ہند

کے جنوب مغرب سے اس "ویران آباد ملک" میں داخل ہوئی تھی، جس میں کچھ "افریقی طنطنہ" تھا۔ ایسا کیوں نظر آتا ہے؟ اس میں اجنبی پن کیوں ہے؟ اس کا جواب سماجی تبدیلی کا عمل ہی پیش کر سکتا ہے۔

پھر گوانی آرکسٹرا ــــ مریانا کا ناچ
چھک چھک ــــ چھکا چھک
دھک دھک، دھکا دھک .... ہے اے اے اے اے ے ے ے ے ے!
ــــ اور کر!

ہیجان، ہیجان، اکسائٹمنٹ! ــــ بیدی جی، جلال جو تمہارا پھلا پرسونا تھا وہ اس نئے سیکولرزم میں "ایکا ایکی بدنظمی کا شکار" ہوگیا۔ اس کے "سب قافیے غلط ہوگئے"، اس کے "ہوش اڑ گئے"، اسے اب ایک نئی مطابقت (ADJUSTMENT) کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جس کی تربیت گاہ گھر (وراثتی معاشرہ) کے بجائے ٹل ہٹ (اجنبی معاشرہ) بنتا ہے۔ جہاں فرد دو جنسی طبقات میں بٹ جاتا ہے (ایک طبقہ مرد کا اور دوسرا طبقہ عورت کا)، اور دونوں میں فاصلے بڑھتے چلے جاتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہو جاتے ہیں، دونوں کے سوچنے کے انداز میں ایک دوسرے سے دوری پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی اصل غایت کے بارے میں قرآن کو بتایا گیا تھا:

> اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمھارے لئے تمھاری ہی جنس سے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی' یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

(قرآن حکیم۔ الرّوم۔ ۲۱)

لیکن اس جنسی طبقاتی فصل نے "محبت اور رحمت" کو افتراق میں تبدیل کر دیا اور پرسونا عورت کو اپنا حریف تصور کرنے لگا، دونوں میں ایک دوسرے سے خوف پیدا ہوگیا اور بے امانی نے اپنے جنسی طبقہ کے حقوق کے بارے میں عدم تحفظ کے احساس کو شدید تر کر دیا:

- مگر غضب خدا کا عورت جو حقہ بھی نہیں پیتی، حقوق مانگتی ہے۔
- پہلے سنیچر کاندھے پر چڑھ بیٹھا تھا۔ ایسے میں کہ عورت سر پر سوار ہوگئی ہے۔

پھر پرسونا کو یہ خیال ستاتا ہے کہ عورت تو صنفِ نازک ہے، وہ آخر اپنی قوامیت کیسے ثابت کرسکےگی۔ چنانچہ وہ اس کی فوقیت کا پہلو کہیں اور تلاش کرتا ہے:

- عورتوں کو تم جانتے ہی ہو، کیسے وہ اپنی کمزوری کا افسانہ مشہور کر دیتی ہیں اور کر

زوری کو بھول ہی جاتی ہیں۔

مگر میں نے دیکھا ہے کہ وہ تو چپکے سے سامنے پڑی رہتی ہے، جیسے روندے جانے کی منتظر۔ اور اگر اس میں مرد ذرا بھی سستی دکھائے تو کیسے اسے طعنے دیتی، ذلیل کرتی ہے۔

رفتہ رفتہ یہ عناد کی روش اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، لہجہ میں تلخی کی ایک زیریں رو ابھرنے لگتی ہے اور بات "چھیڑ خوباں" تک پہنچ جاتی ہے:

عورتوں کے سال والی ایک عورت۔ بیہوش ہو گئی سالی

الٹا شاید عورتوں کا سال منانے کے سلسلے میں اس نے مجھے اپنی باہوں میں لے لیا۔

سال ختم ہونے دو اگر عورت سالی نے اسے صدی پہ نہ پھیلا دیا تو مجھے باپ کا نہ کہنا۔

اس سلسلہ میں تم تیار ہو، باقر، چوں کہ یہ عورتوں کا سال ہے ہمارا تمھارا سب کچھ بک جانے والا ہے۔

لیکن پھر اس پرسونا کو گمان ہوتا ہے کہ کہیں وہ اپنے جنسی طبقہ کے عدم تحفظ کا مظاہرہ (MANIFESTA-TION) تو نہیں کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی صفائی پیش کرتا ہے:

میں مرد شوونسٹ نہیں۔

لیکن یہ معذرت آمیز صفائی اس کے دل کے چور کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو پاتی، اس لئے وہ اس باپ کی سی حرکت کرتا ہے جو ناراض تو دوسرے کے لڑکے پر ہوتا ہے لیکن دھنکائی اپنے لونڈے کی کر ڈالتا ہے۔ اس میں کچھ آزارِ ذات (MASOCHISM) کا پرتو ہوتا ہے:

اگر صدیوں سے مرد نے اسے روندا ہے تو اب وہ اسے روندے۔

کرن ہارنی (KAREN HORNEY) مادری زبان کو بنیادی، فطری اور اولین ترین نظام تصور کرتی ہے۔ اس کے نظریہ کے مطابق پہلے عورت قوام تھی۔ اس میں وہ تمام صفات تھیں جو آج مردوں یا قوی صنف کی صفات تصور کی جاتی ہیں، لیکن جیسے جیسے عورت آرام طلبی کی زندگی (LEISURE LIFE) کی عادی ہوتی گئی، اس کی قوامیت انحصار میں تبدیل ہوتی گئی اور مرد اپنی صنفی زیبائش اور عشوہ طرازی کی عادات اور جسمانی و عصبی نزاکتوں سے آزاد ہوتا گیا۔ اس کے متوازی یہ صفات عورت میں نشو و نما پانے لگیں۔ اور ہزاروں صدیوں کے بعد جب مرد خاصا توانا ہو گیا تو اس نے مادری نظام کا تختہ الٹ دیا اور پدری نظام کو مستحکم و استوار کر دیا۔ بیدی جی، (کہیں ایسا نہ ہو کہ کاتب صاحب تم کو "بیوی جی" لکھ دیں) تم نے اس جلد میں

ہر چند کہ آزار ذات والی خود شکستگی کا المیہ پیش کیا ہے لیکن غیر ارادی طور پر تم کرن ہارنی کے ہم خیال بھی ہو گئے ہو۔ تم نے بھی جنسی طبقاتی تنازع کو ایک حقیقت بنا کر پیش کیا ہے۔ تم سوچتے ہو کہ اگر ایسا ہو گیا تو کیا کوئی امید کی کرن نظر آئے گی؟ پھر تمھارا پرسونا تمھیں خاصی خوش گمانی میں مبتلا کر دیتا ہے:

ایک بات اور بھی ہے۔ آزاد ہو کر شاید یہ عورتیں ہماری عزت کرنے لگیں۔

گویا وہ جو ظاہر داری کے آداب ہیں ـــــ لیڈیز فرسٹ ـــــ ان میں بھی تقلیب ہوگی۔ عورتیں جو مراعات صنفِ نازک ہونے کی وجہ سے حاصل کر رہی ہیں ان سے بھی دست برداری کا اعلان کریں گی اور امتیاز یا وتو ختم ہو جائے گا۔ پرسونا اپنے جنسی طبقہ کی طرف سے صفائی پیش کرتا ہے:

ہم عورتوں کی جتنی عزت کرتے ہیں، یہ خود عورتیں بھی نہیں جانتیں....

تم ہی بتاؤ ہم نے کبھی کسی کو باپ بھائی کی گالی دی ہے؟

کرن ہارنی کا خواب کب شرمندۂ تعبیر ہوگا؟ عورت کب قوامیت کی صفت سے متصف ہوگی، مرد کب اپنی سرشت میں مغلوبیت کو پروان چڑھا سکے گا؟ اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ابھی تو مرد اوپر کے دل سے ترس کھایا جا رہا ہے۔ اپنے پائے ہوئے حقوق سے کون رضاکارانہ طور پر دست بردار ہونا پسند کرتا ہے؟ یہ باتیں تو صرف سیاسی ہیں جن کو ہم طوعاً و کرہاً بدیسی سماجی اقدار کے ساتھ بیگانہ روی کے انداز میں درآمد کر رہے ہیں۔ ایسا کرنے کے لئے خود ہمیں اپنے سماج سے اجنبی بننا پڑا ہے کیوں کہ معیارِ ردّ و قبول ہمارے معاشرتی نظام میں نہیں ہے بلکہ وہاں ہے جہاں سے ہم ٹسل ہٹ مستعارلے کر آئے ہیں۔

بیدی جی، تم کہتے ہو: "مرد سب سے زیادہ کیا پسند کرتا ہے؟ ـــــ عورت!" چلو تم کہتے ہو تو مان لیا، ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ مرد سب سے زیادہ اپنے "میں" کو پسند کرتا ہے۔ عورت تو صرف اس میں کا ایک تمغہ ہے جو مریانا کا روپ دھارے، انجیر کا پتہ پہنے اس کے گرد ناچ رہی ہے۔ اور "عورت: عورت سب سے زیادہ کیا پسند کرتی ہے؟ ـــــ شاپنگ!" شاید یہ وہ عورت ہے جو بار بار پوچھتی ہے "تم میرے لئے کیا لائے ہو؟" ورنہ ساڈی عورت نوں پڑوسن دے نال گلاں کرن توں فرصت کہاں! سب معاشرے کی عورتوں کو ایک ڈنڈے سے کہاں ہنکایا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ عورت "چشمۂ بددور" کی وجہ سے ضمنی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور دو متخالف شخصیتیں ابھرتی ہیں۔

پہلی شخصیت تمھارا پرسونا ہے جو روسی کونسلیٹ میں کام کرتا ہے، اور دوسرا اس کا عکس معکوس جو یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس میں اسسٹنٹ لائبریرین ہے۔ روس کی نمائندگی ڈبل کونیکی چشمہ کرتا ہے اور امریکہ کی نمائندگی ڈبل کانکیو!

عام صحت مند نظر والا اگر ڈبل کانکیو میں سے دیکھے نا بابر بھائی تو اسے ہاتھی چیونٹی دکھائی دے گا جیسے میرے میں سے چیونٹی بھی ہاتھی!

گویا یہ ایک ہی گلیور ہے جو دو شخصیتوں میں بٹ گیا ہے۔ ڈبل کنوکیس والی شخصیت کو بروبڈنگینگ نظر آتے ہیں تو ڈبل کان کیو والی شخصیت کو لل پٹ! دونوں کے چشموں سے دنیا ویسی نظر نہیں آتی جیسی کہ وہ ہے۔" یہی وجہ ہے کہ امریکنوں کو دنیا کے سب لوگ کیڑے مکوڑے نظر آتے ہیں" اور روسیوں نے" عوام کی آنی گردان کی ہے کہ وہ خواص ہو گئے ہیں" ان چشموں کے لگاتے ہی جیسے قلب ماہیت ہو جاتی ہے اور دونوں کے زاویہ ہائے نظر ان کے آقاؤں جیسے ہو جاتے ہیں۔ اگر پرسنا "خالص روسی دبدبہ" پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا عکس معکوس" اپنی انگریزی میں بہت امریکی خنغنہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہندوستانیوں کے بارے میں بیدی جی، تم نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ" یہ امریکنوں سے بھی کچھ زیادہ ہی امریکی ہیں"۔ پھر وہ اپنی پسند ونا پسند میں بھی اپنے آقاؤں کا خیال رکھتے ہیں۔ اگر ڈبل کانکیو اسکاچ یا سی گرام طلب کرتا ہے تو ڈبل کنوکیس نے اس کی لاگ ڈانٹ میں" واڈکا کی حکم کے طریقے سے فرمائش کی، جیسے روسی کرتے ہیں" لیکن وہ دونوں جانتے ہیں کہ انھوں نے صرف نقاب اوڑھ رکھی ہے،" چشمۂ بد" لگا رکھا ہے، ورنہ" ہندی کہیں نہ کہیں سے اپنا منھ باہر نکال ہی لیتی ہے، اور پرسنا اچھی طرح جانتا ہے کہ" وہ واڈکا روس کی نہیں، یہیں کہیں کیرالہ میں کشید کی ہوئی ہے" اس کے باوجود اپنا آپ نہیں بنتے ہیں اپنے آقا بنتے ہیں، خود فریبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا اس میں مبتلا رہنا پسند کرتے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا:

ے خانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں   لاتے ہیں سرور اوّل، دیتے ہیں شراب آخر!

ہوتا بالکل ایسا ہی ہے کہ اسکاچ، سی گرام یا واڈکا کے خمار کے چڑھنے سے پہلے اس وابستگی کا نشہ طاری ہو جاتا ہے جو پرسنا یا اس کے عکس معکوس نے اختیار کر رکھی ہے۔ ان وابستگیوں کی وجہ سے وہ نہ صرف ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہو جاتے ہیں بلکہ اپنے ہی حریف بھی بن جاتے ہیں اور حریف بنتے ہی ان پر یہ بھی واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی جارحیت کا بھی مظاہرہ کریں۔ چنانچہ شروعات چھیڑ چھاڑ سے ہوتی ہے۔ پہلے ایک گھٹیا سا مذاق ہوتا ہے:

.... اور میں نے اس کارڈ انڈ مکس سے پوچھا ــــ آپ کو یاد ہے سہگل کب مرا تھا؟

جانتے ہو کیا جواب دیا اس نے؟ بولا ــــ ابھی ابھی میرے سامنے ہی تو مرا ہے۔

یہ مذاق بہت ہی ذاتی، مقامی اور بے ضرر ہوتا ہے، اس لئے اس سے کوئی گرمی پیدا نہیں ہو پاتی۔ وہ اسلحہ جو وار ٹرگیٹ والے لڑوانے کے لئے بھیجتے ہیں، یا وہ اسلحہ جو روسی بھیجتے ہیں" ان کے ہتھیاروں کو بے کار کرنے

کے لیے" ان میں سے کسی کے استعمال کا بھی موقع ابھی نہیں آیا ہے، چنانچہ مذاق اور بھی کھل کر کیا جاتا ہے :

....آپ جانتے ہیں ایک لائبریرین اور گدھے میں کیا فرق ہے ؟

یہ جملہ بالکل براہِ راست ہوتا ہے، اس لئے دونوں طرف خوف کی سی کیفیت طاری رہتی ہے :

وہ میرے —— روسی جوش کو دیکھ کر تھوڑا ڈر گیا اور دل گکنت سے بولا۔ مجھے نہیں معلوم!

میں نے کہا۔ مجھے بھی نہیں معلوم....

اس عدم واقفیت کے پس پردہ بھی حریف کا خوف ہی ہے۔ لیکن اشتعال کے لئے یہ جملہ کافی ہوتا ہے۔ پہلے ایک دوسرے کی وابستگیوں کو طشت از بام کیا جاتا ہے :

○ اس نے سیدھے ہی روسیوں کی برائی شروع کر دی۔

○ میں نے چشمہ اتار کر میز پر پٹخ دیا اور سی آئی اے کو گالیاں دیں۔

وہ کے جی بی کو بیچ میں لے آیا اور میرے چشمے کا جواب اپنے چشمے سے دیا۔

[چشمہ اتار دینے اور اپنی ناوابستگی کے اعلان میں مماثلت لائق تحسین ہے۔]

○ میں نے روزن برگ کے مار دیے جانے کی بات کی۔ میرا بس چلتا تو اس سلسلے میں فیض کی غزل اس کے منہ پر مار دیتا۔

[فیض نے روزن برگ جوڑے کی سزائے موت پر نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" لکھی تھی، غزل نہیں!]

○ وہ سالاسکھاروف اور سولیژنستن پہ چلا آیا اور اس کی گلاک اور آرکی پیلیگو سے حوالے دینے لگا ——

یہ جوابی الزام تراشیاں رفتہ رفتہ تشدد میں تبدیل ہوتی ہیں :

○ اب ہماری آوازیں اونچی ہو کر ارد گرد کی آوازوں کو لونا کے دے رہی تھیں۔ ارے ارے —— اے پولیس —— سب بے کار ہو گیا تھا۔

پھر بڑے لطیف انداز میں دونوں حریفوں کے تہذیبی و ثقافتی ورثہ کی اساس کو کھودا جاتا ہے :

"تم بات کرتے ہو ینیکی ؟" میں نے چلا کو کہا : "جس کی تہذیب ہی جمعہ جمعہ چار سو سال پرانی ہے۔ جو کبھی ہیش یوگی کا سہارا لیتا ہے اور کبھی پربھوپاد کی دم سونگھتا ہے —— ہرے رام، ہرے کرشن کے بچے !"

"تو کومس کے نطفے ...."

یہ گویا ایک نوعیت سے صحافتی اعصابی جنگ ہے جس کے ذریعہ یہ راز فاش کیا جاتا ہے کہ امریکہ کی کوئی ثقافتی اساس نہیں اور اسی طرح روس کا وہ نظریہ جس پر اسے فخر ہے کہ اس نے اپنے عصر کو ایک نیا اور کامیاب نظامِ حیات عطا کیا ہے وہ دراصل تیرہویں صدی میں کیومس خاندان نے اٹلی میں متعارف کرایا تھا لیکن وہ اس خاندان کے ساتھ ہی اپنی خامیوں کی وجہ سے فنا ہو گیا۔ یہ پروپیگنڈائی لٹریچر جس سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، اس پر یہ چھڑپ بے حد لطیف طنز ہے۔

اب لڑائی اس سے بھی اگلے مرحلے میں داخل ہوتی ہے:

اور ہم دونوں بیک وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور گرج گرج کر باتیں کرنے لگے —
"تم ہندوستانی جاہل ہوتے ہو، بدتمیز ہوتے ہیں"۔ اس نے کہا — "دروازہ کھٹکھٹائے بغیر تو کمرے میں چلے آتے ہو۔"
میں نے اسی پاٹ دار آواز میں کہا — "ہندوستانی تو ہوگا، تیرا باپ، تو جب اس دنیا میں آیا، کوئی بھی دروازہ کھٹکھٹایا؟
اب تک ہم دونوں مکمل طور پر روسی اور امریکن ہو چکے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہیں پاٹ پر سے آواز آرہی ہے۔ رکو، رکو۔ لیکن ہم دونوں اس بات کے لئے تیار تھے کہ بٹن دبائیں اور دونوں ملکوں کے آئی سی بی ایم چھوڑ کر نیویارک اور ماسکو کو تباہ کر دیں۔
اسلام آباد اور نئی دہلی کا یہ حشر دیکھا جائے گا۔

نوآبادیاتی ملک یہی سوچتا ہے کہ یہ جنگ جو ہو رہی ہے، اس کی جنگ نہیں ہے، بلکہ یہ نیویارک اور ماسکو کی جنگ ہے اور ہم جو جنگی سامان کی منڈیاں ہیں ہم اپنی دشمن عالمی طاقت کو فنا کر دیں گے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ آئی سی بی ایم والے تو اپنی سرنگوں کو تو مضبوطی سے سنبھالے رہتے ہیں اور:

میں نے خالص پرولتاری انداز سے جوتا اتار کر میز پر مارا، اس سے دونوں چشمے میز پر یوں اچھلے جیسے وہ مرغ ہیں اور آپس میں لڑ رہے ہیں۔

مرغوں کی یہ لڑائی ہوتی رہتی ہے اور دونوں لڑانے والے پالی میں جنگی دانہ ڈالتے رہتے ہیں اور اپنے اٹھکی تجرباتی کامیابی سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ جنگ میں نوآبادیاتی ملکوں کا یہ التباس زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہتا ہے:

اب جس زبان سے وہ گالی دے رہا تھا، وہ کسی ملک کی نہ تھی، یہ وہی آواز تھی جو زبان کی ایجاد سے صدیوں پہلے انسان غاروں میں بولا کرتا تھا۔ یا ہو سکتا ہے وہ کوئی فری میسنری

ہو، کوئی اسپرانٹو ۔۔۔ اب مجھے یاد آتا ہے وہ گُرگُر کلاں تھی! ایک بات طے ہے کہ انکا غنغنہ اب ہندوستانی بھی نہ رہا تھا۔

ہوسکتا ہے کو کو کو کلاں سے اشارہ شمالی امریکہ کے شمال مغربی ساحل کے قدیم قبیلے کو اکیلٹ کی طرف ہو، لیکن بہرحال بڑی طاقتیں جس طرح پس ماندہ اور دست نگر قوموں کو جنگ کے جہنم میں جھونک دیتی ہیں اسے اس وقوعہ کے ذریعہ بیدی نے بڑی فن کارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کس طرح پہلے ہم محض کیمپوں کی کی لڑائی شروع کرتے ہیں لیکن بالآخر وہ ہماری اپنی جنگ بن جاتی ہے ۔ وہ جو جنگ کے ابتدائی مرحلہ میں مکمل طور پر روسی یا امریکن ہو جاتے ہیں وہ آخر آخر تباہی کی اس انتہا تک پہنچ جاتے ہیں کہ ان کی زندگی غیر مہذب انسان کی غاروں کی زندگی کے مماثل ہوجاتی ہے ۔ اب ان میں "ہندوستانی غنغنہ" بھی نہیں رہتا۔

ترقی پذیر ملکوں کے سینچر کے کوپ کو بیدی جی تم نے جس طرح افسانہ کا موضوع بنایا ہے اور جس فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ تم نے اسے پیش کیا ہے اس کا تقاضہ تھا کہ میں افسانہ کے اس حصہ سے اس وقوعہ کو اخذ کرکے اپنی سمجھ کے مطابق ترتیب دوں (ممکن ہے میری سمجھ کی کمی کی وجہ سے تمہارے افسانہ کا حسن مجروح ہوا ہو) تاکہ جنگ کے اس عمل (PROCESS) کو نمایاں کرسکوں جس کو تم نے بڑے ایمائی انداز میں پیش کیا ہے۔

جنگ کی اس تباہ کاری کا آخری مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب دونوں حریف اپنے اپنے گھروں (ملکوں) کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔ ان کے نظریات متزلزل ہو چکے ہیں، اپنے محافظ پر سے اعتبار اٹھ چکا ہوتا ہے:

باقر بھائی ... ہمارے چشمے بدل گئے تھے۔ اس جھگڑے فضیحتے میں وہ میرا چشمہ لے گیا تھا اور اس کا میرے ہاتھ میں آگیا۔ قریب قریب ایک ہی سے تھے یا ہمیں ایسے لگ رہے تھے۔

یہ چشمے بدلنے کا حادثہ دراصل موقف میں تبدیلی کی طرف اشارہ ہے۔ کس قدر جلد جلد ترقی پذیر ممالک ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ میں منتقل ہوتے رہتے ہیں ہم روز ہی مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ نہیں سوچتے کہ "یہ فریم قریب قریب ایک ہی سے ہیں" یعنی بڑی طاقتوں کے مقاصد بالکل یکساں و مماثل ہیں، بس فرق صرف نقطہ ہائے نظر کا ہے ۔۔۔ ڈبل کنونکس یا ڈبل کان کیو! ۔۔۔ ہم دونوں میں سے کسی نہ کسی ایک کے محتاج ہی رہتے ہیں۔ اور جنگ کے بعد جب ہمارے زاویۂ نظر میں تبدیلی آتی ہے تو سب کچھ اتھل پتھل ہو جاتا ہے۔ ہمیں اپنا ہی قدم نیچے کا معلوم ہونے لگتا ہے، اپنے راستہ کی پہچان نہیں رہتی۔ اپنے گھر کا دروازہ ہم پہچان تو لیتے ہیں لیکن صرف اندازہ سے۔ جن کو دوسرے انسان صرف کیڑے مکوڑے نظر

آتے تھے۔ ان کو اپنی خامیاں کئی گنا بڑی نظر آنے لگتی ہیں اور جو دوسروں کی کمزوریوں کو دیو قامت بنا کر دیکھنے کے عادی تھے۔ وہ جب اپنے گرد و پیش کو اصل حالت سے کبھی چھوٹا کر کے دیکھتے ہیں تو انھیں ہر چیز پر پیار آنے لگتا ہے لیکن ان نو آبادیوں کی بدنصیبی یہ ہے کہ انھیں اپنی نظر سے کچھ نظر آتا ہی نہیں ہے :

> تھوڑی دیر میں سمجھ کے اوپر آجانے سے ہم دونوں نے چشمے اتارے اور دو بھوتوں کی طرح ایک دوسرے پر بڑھے۔

بارے ان چشموں کے اتر جانے کے بعد انھیں یہ احساس تو ہوا کہ :

> وہ کہہ رہا تھا میرا قصور ہے، میں کہہ رہا تھا میرا دوش۔ ہم نے خود کو گالیاں دینا شروع کر دیں، گویا اس آدھی رات اور سوادن میں، ہم پورے ہندوستانی ہو چکے تھے۔

یہ امر بھی بڑا رمزیاتی ہے کہ "اعتراف" کا یہ وقوعہ بھی لٹل ہٹ کے سامنے ہوا لیکن ان نو آبادیوں کا کام "چشمۂ بد" کے بغیر چلتا بھی نہیں ہے۔ چنانچہ جب تک یہ چشمے واپس نہیں مل جاتے اضطرار مسلسل اضطرار کا عالم طاری رہتا ہے۔

بیدی جی، اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے یہ افسانہ بڑے پریم سے لکھا ہے۔ تم نے اس کے معنی کی کئی سطحیں پیدا کرنے کی کاوش کی ہے۔ تم نے دلّی میں اس افسانہ کا کچھ حصہ خود سناتے ہوئے کہا تھا کہ "باقر سے کوئی خاص شخص مراد نہیں ہے، یہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "میں" سے بھی کوئی خاص شخص مراد نہیں ہے، یہ بھی کوئی بھی فرد ہو سکتا ہے۔ میں نے اسی وجہ سے اسے تمھارا پرسونا قرار دیا ہے۔ تم نے اس افسانہ میں تین الگ الگ موضوعات کو چھیڑا ہے، جن کے بارے میں بادی النظر میں یہ احساس ہوتا ہے کہ ان میں آپس میں کوئی ربط نہیں ہے، لیکن جب مرکزی خیال پر توجہ دی جاتی ہے تو "چشمۂ بد دور" ایک ایسی دعا بن جاتا ہے جو فن کار اپنے معاشرہ کو بڑی طاقتوں کے استحصال سے بچانے کے لئے دیتا ہے۔

[اور یہ واقعہ بھی سنیچر ہی کے روز ہوا کہ یہ آخری سطریں نئے سال کے پہلے سنیچر کی صبح کو لکھی گئیں]

□

ظ۔انصاری

راجندر سنگھ بیدی ـــ بیدرد کردار نگار

(یہ میرا مضمون نہیں ایک تاثر ہے، جس کا آدھے سے کم حصہ پہلے چھپ چکا ہے۔ ظ۔ا)

برسوں پہلے کی بات ہے: صبح سویرے میں ان کے پرانے گھر پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ کھڑکی پر کسی نے دستک دی۔ بیدی دروازہ کھولنے گئے۔ ایک سن رسیدہ شخص اندر آیا، بدحواس تھا۔ ہاتھ میں دواؤں اور انجکشنوں کا بل۔ امداد کا خواستگار۔

"سردار جی روپیہ نہ دیجئے۔ دوائیں دلوا دیجئے... میرے لڑکے کی حالت..."

کافی رقم بنتی تھی۔ بیدی نے سر جھکا کر مجھے دیکھا۔ "چلئے"؟

کار نکالی۔ ہم تینوں چلے۔ دادر کی ایک دوکان، پھر دوسری، پھر تیسری۔ دوائیں خرید کر اس کے حوالے کیں اور گاڑی کنارے کر کے رونے لگے۔ ہچکی بندھ گئی۔

کچھ دن بعد میں نے اپیندر ناتھ اشک سے ایک اتفاقی ملاقات میں یہ واقعہ بیان کیا۔ تو وہ بولے "جس مرض کی وہ دوائیں بتا رہے ہیں آپ، اُسی میں بیدی کے باپ کی موت ہوئی تھی۔"

عجیب نہیں کہ اس روز آنسوؤں کی اچانک یورش میں باپ کی مفلسی یا موت کا غم بھی شامل ہو۔ لیکن بیدی کا تو لوں بھی ہنستے ہنساتے رو پڑتے ہیں۔ اتنے رقیق القلب ہیں کہ لطیفے اور چٹکلے سنا تو گویا ان کے وجود پر کچھوے کی پیٹھ کی ایک ڈھال بنا رہتا ہے جس پر واقعات ٹکرا کر اچٹتے اور "پرابولائی" (PARABOLICAL) انداز میں اچھلتے ہیں۔ "گرم کوٹ" سے لے کر "ہاتھ ہمارے قلم ہوئے" تک مسلسل یہ منظر کھلے گا کہ مصنف آنسو پونچھتا اور مسکراتا جاتا ہے۔

خوشی میں تو ہوئی، غم میں بھی ایک طاقت ہوتی ہے غم انسانی خصلتوں، صلاحیتوں اور نیم خواب جوہروں کو، بعض اوقات، ٹھوکر لگا کر جگا دیتا ہے۔ جس نے بھی راجندر سنگھ بیدی کو توجہ سے پڑھا ہوگا، وہ جانتا ہے کہ اس ترشی ہوئی داڑھی مونچھ کے پردے میں تبسم محض ایک خوشگوار زرتار نقاب کی طرح جھلملاتا رہتا ہے اور زیر پردہ غموں کی نبض رگ و ریشے تک اتر تی چلی گئی ہیں۔ ہم انھیں چھیڑنے اور ستانے کو "پلک موتنا" (‎[illegible]‎) کہہ دیتے ہیں۔ کیونکہ بات بات پر ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ وہ کسی واقعے کو مسکرا مسکرا کر بیان کرنے

لگیں گے تو واقعے کے کسی پہلو، کسی موڑ پر آواز بھرا جائے گی۔ آنکھیں بھر آئیں گی۔ وہ افسانہ سناتے ہوں گے اور اچانک کاغذ پر ٹپ سے ایک آنسو آ رہے گا۔ وہ اپنے ہر ایک اہم اور مرکزی کردار کے ساتھ، ہنسے یا نہیں، روئے ضرور ہیں۔ میرؔ نے ایسی ہی طبیعت پر کہا ہوگا۔

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

جب سے انھوں نے نام پایا، سماجی وجاہت پائی اور لوگوں نے ان کی صحبت کی قدر جانی۔ یہ ایک چلن ہو گیا کہ بیدی ہوں تو لطیفے سنائیں۔ (سردار جی کے لطیفے وہ نمک مرچ لگا کر گڑھتے اور سناتے رہتے ہیں اور اپنی شکل صورت سے بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں) لطیفے گڑھنے سنانے میں وہ اپنے مقام و مرتبے تک کا لحاظ نہیں کرتے آس پاس لوگ قہقہے لگائیں دیر تک پڑے لوٹتے رہیں، اس کی مسرت ان کی آنکھوں میں چمکتی رہتی ہے اور پھر اچانک وہ اداس ہو جاتے ہیں۔ کہیں کسی کردار کا، کسی لمحے کا غم اپنی ٹوک ان کی پسلیوں میں چبھو دے گا۔ وہ کچھ سے کچھ ہو جائیں گے۔

ایک عام سی غلط فہمی ہے کہ حسن بے درد ہوتا ہے۔ ورنہ سچ پوچھو تو عشق بے درد، جو اپنے پرائے کے فرق کا روادار نہیں۔ عاشق خود اپنے ساتھ رعایت نہیں کرتا، اپنے بال بچوں اور دوستوں کے ساتھ مروّت نہیں کرتا۔ اور جب اسے مشاہدے اور اظہار کی فنکارانہ صلاحیت بھی میسر ہو تو "پھر" ہے زبان اس کی جوہر دار"۔ اس ضمن میں بیدی کے تعلق سے صرف دو منظر دکھاتا ہوں:

کشمیر میں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت ترک کرکے جب وہ بمبئی کی فلم نگری میں آن بسے، لوگوں سے میل جول بڑھا (۱۹۴۸ - ۴۹ء) تو ہر شخص ان کی نیکی، شرافت، بھلمناہت کا قصیدہ خواں بن گیا۔ ادیب بیدی، شریف بیدی شمار ہونے لگے۔ بس! کمیونسٹ خیالات کے جلسوں، مباحثوں اور اسٹیجوں پر بھی، خواہی نخواہی، شریف بیدی، کی بے عیب مورتی دکھائی دینے لگی۔ کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کی معاصرانہ چشمک کا ذکر سرگوشیوں میں چلتا۔ لیکن کبھی کسی نے کرشن چندر کی زبان سے بیدی کے بارے میں حرف کدورت یا کاٹ کا کوئی لفظ نہ سنا۔ بیدی امن کونسل کے جلسوں کی صدارت کرنے لگے۔ گھر پہ کسمساتے، باہر فرض نبھا جاتے، پوچھئے ایسا کیوں؟ تو وجہ یہ کہ وہ آئے تو ملک راج آنند کے ہاں ٹھہرے۔ اٹھتے بیٹھتے تو ان ہی لوگوں میں، جو کمیونسٹ تحریک کے اندر یا آس پاس تھے۔ جب گھر چھایا تو وہاں روپوش یا پناہ گزیں کمیونسٹوں کو پناہ ملنے لگی

کیفی اور مجروح ان کے ہاں ہفتوں اور مہینوں رہے۔ اپنی کمائی کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرورت مندوں پر لٹانے میں کبھی پیش پیش تھے۔ سخت لفظ، اونچے نعرے، گھونسا چھاپ تقریر یا تحریر سے ان کے مزاج کا تباہ تھا ہی نہیں۔ تو یوں جتنی نیک نامی ملی وہ ان کا ایک خاص [غیر ادبی غیر نزاعی] امیج یا پیکر تراشتی چلی گئی۔ اس قماش کا آدمی کرسی صدارت پر بیٹھ تو سکتا ہے (کیوں کہ بٹھا دیا جاتا ہے) مگر لیڈری کی باگ ڈور مضبوطی سے نہیں تھامتا۔ نہ اس میں اپنا دل ڈالتا ہے (بعد کے ایک انٹرنیشنل اجلاس (۷۵ء) میں تو سوویت والوں کے ایک فوری جوڑ توڑ سے ملک راج آنند کو صدارت سے قلمزد کر کے ہاتھوں ہاتھ بیدی کو نامزد کر دیا گیا اور وہ راضی بھی ہو گئے، لیکن کرسی سے اتر کر آنند کے لئے ہاتھ دھو لیے)

اچانک شہر میں غلغلہ اٹھا بیدی کی "بدعملی" کا اپنے پیشے کے سلسلے میں ہی انھیں کسی سے وہ ہو گیا، وہ جو اپنی قربان گاہ میں سب سے پہلے "نیک نامی" کو جھٹکا کرتا ہے۔ اب وہ خود اوروں کا ذکر کبھی شکر خند اور کبھی زہر خند کے ساتھ کرنے لگے۔

"اس [فلم] انڈسٹری کا باوا آدم بھی نرالا ہے۔ مرزا غالب کے ڈائلاگ لکھیں راجندر سنگھ بیدی اور سوہنی مہینوال لکھیں علی سردار جعفری"۔

ہر پیشے میں پیشہ ورانہ کشمکش تھوڑی بہت تو ہوتی ہی ہے۔ بیدی اپنی طبیعت سے ایسے کہ جہاں سامنے والی ہرے پتوں کی ٹہنی کی طرف دوسری بکری متوجہ دکھائی دی، اسے چھوڑ کر دوسری طرف ہو لئے تاہم ان کی نیک نامی پر زوال آنا شروع ہو گیا۔ اور تبھی میرا دل ان سے ملا۔ (مجھے اس آدمی میں کھوٹ نظر آتا ہے جس کی سب لوگ بیک زبان تعریف کر رہے ہوں) میں نے ان سے یہ بات کہی تو بڑے خوش ہوئے۔ اپنا قصہ — بلکہ قصے (AFFAIRS یا واردات کے معنی میں) پوست کندہ سناتے چلے گئے، پتہ چلا کہ واردات میں نشیب و فراز تھے۔ جتنی بڑی شادمانی — اتنی ہی بڑی محرومی۔ وصل میں بھی ہجر کا کھٹکا لگا ہوا تھا — سو وہ مرحلہ آیا — اور ہمیشہ کے لئے آیا۔ اپنے لہو کی بوند دائمی جدائی بڑی جان لیوا ہوتی ہے!

غم پالنے کا سلیقہ تھا۔ کام چل گیا۔ لیکن اندرون خانہ جو فتنہ برپا ہو جائے اس کا توڑ پیغمبر ابراہیم سے نہ ہو سکا تھا۔ بیدی بچارے کیا۔ بڑے لڑکے تک نے گھر چھوڑ دیا۔ گھر کی دیواریں ان کے لئے اونچی ہوتی چلی گئیں (وہ دوستوں کی دعوتیں بھی گھر پر نہیں، گھر سے باہر ہوٹلوں میں کیا کرتے اور اس صورت حال پہ حسرت زدہ رہتے) پھر انھیں فلم لکھنے میں جو بے بسی کا عنصر شامل ہے، اس سے مقابلے کی سوجھی۔ خود فلم بنائیں۔ جیسی لکھیں ویسی بنا کر دکھائیں "دستک" بنائی۔ بناتے بناتے پھر دل کو ایک آزار لگا لیا۔ فلم تو اچھی

بنی، سماجی کاموں، خدمتوں، آمدنیوں اور آسائشوں کی راہ پٹ ہو گئی۔ پھر ہاتھ خالی۔

تنگ آ کر طے کیا کہ بس ایک فلم، مارکیٹ کے لئے، روشِ عام سے ذرا ہٹ کر، ایک فلم — ایسی کہ دھوم مچ جائے اور تجوری بھر جائے۔ بنائیں اور پوٹلی اٹھا کر پنجاب کی طرف نکل جائیں۔ لکھنے لکھانے میں بسر کریں۔ منشی پریم چند بھی یہی سوچ کر بنارس سے بمبئی آئے تھے۔ ڈیڑھ برس بعد بھاگ لئے۔ بعد میں تو کمبل نہیں چھوڑتا بیدی برسوں کی کوشش اور نیت کے باوجود اس کمبل سے اپنی جان نہ چھڑا سکے۔ پھر اسی کے ہو رہے۔

مگر اس میں ڈوب نہیں گئے۔ سال میں دو تین افسانے لکھ لیتے۔ فلم ٹیکنیک سے انھوں نے افسانوں میں فیض تو اٹھایا، اس کی ترغیب پر لپکے نہیں، ان کا فن دریا میں غوطے کھا کر بھی سلامت رہ گیا۔

ضد، کہتے ہیں کہ بری بلا ہے۔ فنکار میں اگر یہ بری بلا نہیں تو وہ کس کام کا۔ موم کی ناک ہو جائے۔ ضد ان میں بلا کی ہے۔ گھر پر شاید بھول بھی جاتے ہوں، محفل میں دکھا دکھا کر سگریٹ دھونکنا نہیں بھولتے۔ یہ بھی ویسی ہی بات ہے جیسی سردار جی کے نام سے منسوب کر کے لطیفے اور چٹکلے سنانا اور خود ہنسی میں شریک ہونا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ ان کی کار خراب تھی۔ میں اور وہ سڑک پر نکلے۔ میں نے ایک ٹیکسی روکی۔ "چلو گے؟" — "ابھی نہیں جی" — بیدی بولے "یہی جائے گا مگر پانچ منٹ بعد۔" واقعی۔ وہ تو پانچ منٹ گذار کر راضی ہو گیا۔ بیدی بولے "گھڑی دیکھو — سردار ہے۔ اب بارہ بج کر پانچ منٹ ہو گئے نا؟"

یہ انھوں نے ایسے کہا جیسے بیان واقعہ ہو۔ یوں ان کا تصور اور تاثر کچھ اس طرح کا ہے کہ اگر کہیں کسی محفل میں انھیں کوئی شخص "سردار جی" کہہ کر خطاب کرے تو ہم چونک پڑتے ہیں کہ ارے، بیدی کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے! بھئی! یہ تو اپنے بیدی ہیں!

ضد اور "کر کے چھوڑوں گا" کی ردیف ان کی گھریلو زندگی کے لئے، جو "گرم کوٹ" والے زمانے میں خوشگوار رہی ہو گی۔ ایک ناسور بن گئی۔ جن دنوں ان کا ناول "ایک چادر میلی سی" کا بڑا چرچا تھا، "ہاتھ ہمارے قلم ہوئے" کے افسانے بھی لکھے جا رہے تھے، "فلم آنکھن دیکھی" کی تیاریاں بھی زوروں میں چل رہی تھیں، دل و دماغ جذب ہو گئے کسی تازہ ترین واقعے میں (جسے وہ شاید کبھی "در حدیثِ دیگراں" لکھ سکیں) بیدی کی تمام تر صلاحیتیں سردی کی صبح الاؤ کے شعلے کی طرح یکبارگی بلند ہو گئیں۔

"کیا کہوں — سات برس! وہ دو: پوتر دوانے ہیں کہ کوئی کیا کھا کے..."

جس روز وہ اپنی بیوی کی آخری رسوم ادا کر کے، راکھ لے کر نکلے ہیں، بار بار کہے جاتے تھے "میں نے جلایا ہے اسے، میں نے یہاں تک پہنچایا ہے۔"

مگر کس چارہ گر کے پاس، کس مسیحا کی زنبیل میں اس درد کی دوا پائی گئی آج تک؟ "شیشوں کا مسیحا

کوئی نہیں!"

جوان بیٹا بالآخر ان کے پاس اور اسی فلم انڈسٹری میں لوٹ آیا ــــ بیدی اس کے لئے باپ تھا فنکار نہیں۔ بیدی، جس نے "ایک سگریٹ" افسانے میں بیٹے کی نفی اور اس کی سعادت مندی کی قدر کی تھی ــــ جس نے مشاہدوں اور تجربوں کے تجزیے میں انتہائی بے دردی (فنکارانہ بے دردی) سے کام لیا تھا، اب اس بے دردی کا شکار تھا کہ دوسرے پروڈیوسروں اور فلمکاروں کی جن جن مصلحتوں سے پچیس برس بدکتا اور ان پر جھلاتا رہا، اب پروڈیوسر بیٹے کی زبان پر ان ہی کے تقاضے تھے: ایسے نہیں، ویسے لکھئے تو کام چلے۔ آپ فلاں کی طرح کیوں نہیں لکھتے فلمی کہانی؟

بیدی ــــ کہ آج تک بظاہر بزم آرائی کا شوقین اور بباطن تنہائی کا ستم زدہ تھا، اب دوہری نہیں تہری تنہائی کا محبوس ہوا۔ "آنکھن دیکھی" فلم تو ایسی بنائی کہ بایدوشاید، "کوئی کیا کھاکے ..." لیکن ایک ایک کرکے سارے غم اس پر ٹوٹ پڑے۔ گفتنی ناگفتنی۔ ان آنکھوں نے انسانی مسرت کی جھلکیوں کو اِنفارج کرنے سے زیادہ غموں کی تہہ در تہہ گہرائیوں میں اتر کر دیکھا بھی ہے اور قلم کی تہہ داری سے دکھایا بھی ہے ــــ وہ آنکھیں یک بیک اداس رہنے لگیں۔ قصیدہ خواں اور قدرداں کترانے لگے۔ اب وہ خود بھی تنک مزاج ہو چلے تھے۔

اس غم کا سوتا کہاں ہے؟ اپنی زندگی کے دکھوں میں؟ وہ بھی ہوگا۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں ایک نہ ایک مقام پر ہمارا سامنا ہوتا ہے بچوایشن (SITUATION) سے جہاں آدمی کا چہرہ اور چہرے پر اُبھلے پسینے کی دھار صاف دکھائی دیتی ہے بچے، عورتیں، گھریلو عورتیں، فنکار لڑکیاں، دستکار، نچلے متوسط طبقے کے سفید کار لوگ، اور بھولے بھالے لوگ، کہیں زمانے کے ہاتھوں، کہیں اپنے بھولپن کے مارے صورتِ حال کے ستائے ہوئے کردار، ریت رسم اور محرومی کی برکھا میں بھیگے ہوئے لوگ۔ بیدی کے افسانوں میں ان کہے غم کہہ جاتے ہیں۔ یوں مسکرا کر کہتے ہیں کہ انسانی مسکراہٹ کے بارے میں ہمارا پورا نقطۂ نظر آزمائش میں پڑ جاتا ہے۔ ہم پہلی نظر میں افسانہ نگار کا وجود بھول جاتے ہیں، کچھ دیر بعد افسانہ نگار مسکراتا اور آنکھیں پونچھتا ہوا برآمد ہوتا ہے "دیکھا آپ نے؟ زندگی کو برتنے کا ایک زاویہ یوں بھی ہے۔ میں اس آدمی کی تنہائی کی بے زبانی میں شریک رہا ہوں"۔

اس غم کا اتھاہ سرچشمہ کہاں ہے؟ اِزموں اور فارمولوں سے داہنے بائیں بھٹکتے پھرتے ہیں، معمولی سے معمولی آدمی کی معمولی سے معمولی آپ بیتی میں جگ بیتی کے کتنے سارے چیتر دگرد غبار میں اَٹے پڑے ہیں۔ انہیں جھاڑ پونچھ کر دیکھنے کو آنکھیں درکار ہیں برادر! نیاز مندانہ تلاش کرد انسان کے غم و مسرت

کے ابھے ہوئے تاروں کی تو خدارسی سے آدم رسی کی جانب سفر کروگے۔ بیدی کا خیال کرو تو میر کا شعر بہت یاد آتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

بندے کے دردِ دل کو کوئی نہیں پہنچتا
ہر ایک بے حقیقت یاں ہے خدا رسیدہ

اس غم کو کس آنچ میں پالا گیا ہے؟ گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں اور ناگواریوں کی آنچ میں۔ "بھولی" "اندو" اور "لاجونتی" گیلی لکڑیوں میں پھونکیں مار کر چولھا سلگانے والی گرہستنیں رُومانی عورتیں نہیں ہیں۔ اغوا کے بعد واپس لائی ہوئی لاجونتی اپنے دھرماتما شوہر سندر لال کے سینے پر سر رکھ کر بتاتی ہے:

"اگرچہ وہ مارتا نہیں تھا پر مجھے اس سے زیادہ ڈر آتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی تھے، پھر بھی تم سے ڈرتی نہیں تھی۔ اب تو نہیں مارو گے؟"

"سندر لال کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسف سے کہا۔

"نہیں دیوی، اب نہیں ماروں گا، نہیں ماروں گا۔"

"دیوی!" لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔

"بھولا" شروع کی کہانی سے "بل" ۱۹۶۲ء کی کہانی تک "گرہن"، "اغوا" "چھوکری کی لوٹ" "کوکھ جلی" "گرم کوٹ"، "دس منٹ بارش میں" "گھر میں بازار میں" "لمبی لڑکی" اور "مٹو گیا" میں "زنگولی" اور "دستک" میں اور بالآخر "ایک چادر میلی سی" میں عورت مرکزی کردار ہے۔ گھریلو عورت یا وہ عورت جس میں گھر کی تمنا اور ماں کی ممتا کروٹیں لیتی ہے۔ یہ ہیروئک (HEROIC) یا تاریخی کردار نہیں ہیں۔ معمولی سے کردار ہیں جن کی جانبازی ان کے معمولی پن میں پوشیدہ ہے۔ خود افسانہ نگار کا ظاہراً معمولی پن ان ہی کرداروں کے ساتھ ابھرتا ہے اور غیر معمولی ہو جاتا ہے۔ بیدی اپنے ان کھردرے، سچے اور ٹھوس پیکروں کے اسٹوڈیو میں پریم چند اور فراق کی حقیقت پسندی اور یلدرم و نیاز فتحپوری کی رومانی تصویر کشی کو بہت پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔

کیا میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ راجندر سنگھ بیدی پچھلے تیس سال میں اردو کا سب سے گہرا، تیکھا انسانی تجربات سے مالا مال، سوچنے اور سوچا جانے والا افسانہ نگار ہے؟ ہاں کہنا یہی ہے بشرطیکہ منٹو، قرۃ العین حیدر اور کرشن چندر کی جداگانہ اہمیت کم نہ ہونے پائے۔

دسمبر ۷۰ء کے شروع میں شہر آیا تو اخباروں اور دوستوں کی زبانی پتہ چلا کہ راجندر سنگھ بیدی پر لقوہ کا حملہ ہوا اور وہ ملنے جلنے تک سے معذور ہو گئے ہیں۔ ان کے بڑے لڑکے نریندر بیدی کے یہاں پہنچا۔ باہر ہی ایک آرام کرسی پر تکیوں کے سہارے آدھے بیٹھے آدھے لیٹے تھے۔ کچھ کچھ پہچان کر گردن کے ہلکے سے اشارے سے انھوں نے

پاس بیٹھنے کے لئے کہا۔ ان کے منہ کے قریب میں نے کان لگایا۔ بظاہر وہ بول رہے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں خدا جانے کیا کہہ رہے تھے، صرف ایک لفظ "اچھا" سمجھ میں آیا۔ جو حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اس پر یقین کرنے کو جی نہ چاہا۔ ڈوبے ہوئے دل سے میں واپس آیا۔ ہائے، یہ وہی راجندر سنگھ بیدی ہیں کہ جس محفل میں بیٹھ جاتے وہاں خوش کلامی اور بذلہ سنجی کی لہر دوڑ جاتی۔ یہ وہی بیدی ہیں کہ روتی صورتوں کو ہنساتے، اور ہنستوں کا حوصلہ بڑھاتے اور "اپنے دکھ مجھے دے دو" کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اب زبانِ حال سے بے بسی اور بے زبانی کی مورت بنے بیٹھے تھے۔ بیٹھے بھی کیا، بٹھائے گئے تھے بمشکل۔

دو ہفتے گذر گئے۔ میں نے پھر فون کیا کہ بیدی صاحب کا کیا حال ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ تو کھار سے اٹھ کر قلابہ (یعنی ۲۵ کلو میٹر دور) چلے گئے۔ "اب وہیں ٹھہرے ہیں آپ کے گھر کے پاس" "اوہ رے، ارادے کی طاقت! یہ آدمی ہے کہ اردو افسانے کا بھیشم پتامہ کے بدن تیروں سے چھلنی، مگر....." میں دم بخود رہ گیا۔ قلابہ میں وہ اپنی دوسری بیٹی منی کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ باقاعدہ روزمرہ کا صاف ستھرا لباس پہنے پگڑی باندھے سیدھے بیٹھے تھے۔ میں خواجہ عبدالغفور کے ساتھ گیا تھا۔ دونوں کا خیر مقدم کیا۔ ہاتھ ملایا۔ وہی پانچ سات دن پہلے کھچی اور پٹیوں میں بندھا ہوا تھا۔ دیر تک کچھ کہتے رہے۔ مجروح اور اختر الایمان کو یاد کیا کہ ان سے ملاقات نہیں ہوئی کئی روز سے۔ داہنا ہاتھ گھمایا، پھرایا، انگلیاں سیدھی نہیں ہو رہی تھیں۔ بولے:

"اور چند روز کی بات ہے، یہ ذرا سیدھی ہو جائیں، لکھنے لگیں گی۔ میں ٹھیک ہو جاؤں تو لکھوں گا ضرور......"

"گھی تو ٹیڑھی انگلی سے نکلتا ہے بیدی صاحب....." مسکرائے، پھر تھمے، پھر مسکرائے۔ پھر زندگی کے پچھلے باب کو فلم کی ریل (REEL) کی طرح کہیں فضا میں چلتے دیکھا خلا میں غور سے دیکھ کر کہنے لگے:

.....میں سمجھتا تھا، واقعہ ہے، سخت ہے، گذر جائے گا۔ مگر واقعہ تو زندگی پر چھا گیا۔ خیر دیکھتا ہوں لکھوں گا۔ شاید لکھ ہی دوں گا.......

پھر وہ لوگوں کے بارے میں کہتے سنتے رہے اور جب ہم چلے تو اپنی عادت کے مطابق پہنچانے بھی آئے۔ دونوں پاؤں ناپ تول کر رکھ رہے تھے۔

•

ادھر کے ڈیڑھ برس میں انھیں افاقہ ہوا ہے۔ ضد کو ارادے کی قوت ملی ہے۔ فنکار کو جینے کے حوصلے نے سہارا دیا ہے (کیفی کی حالت تو ان سے بھی خستہ تر تھی، ہاتھ پاؤں مار کر آخر نکل آئے اور آج کل پہلے سے زیادہ ہی سرگرم ہیں) ذرا انگلیاں سیدھی ہو جائیں، ذرا ذہن استوار ہو جائے، اور ذرا..... ذرا.....

راجندر سنگھ بیدی نے زندگی کی بڑی اونچ نیچ دیکھی۔ پنجاب کے خوشحال قصبوں اور بدحال لوگوں کی بپتا، نیم تعلیم یافتہ حلقوں کی رسمیں، رواداریاں کشمکشیں اور نباہ کی تدبیریں، پرانی دنیا اور نئے خیالات کی آویزش، نئی نسل اور ارد گرد کے بندھنوں کی آمیزش ـــــ ان سب میں بیدی نے دہشت کی بجائے زمیوں کو چن لیا۔ "زمیاں" اپنے پورے اور پیچیدہ مفہوم کے ساتھ ان کے مطالعہ کائنات کا اصل اصول اور مرکزی نقطہ ہے۔ بھیانک میں سے ملائمت کو اور ناگواریوں میں سے گوارا کو تلاش کرنا ان کے اندر فن کار کا اصل کرتب ہے۔ بے دردی سے دیکھنا، کریدنا، بے دردی سے برتنا اور دردمندی سے ان کو کاغذ (یا سلولائیڈ) پر اتار دینا اس دکھی آتما کا ایک بڑا کارنامہ ہے جو منفرد بھی ہے اور شاداب بھی۔ □

رام پال
پٹھان کوٹ روڈ، ڈاک خانہ رائے پور،
رسول پور، جالندھر ۱۴۴۰۰۴

ایک سڑک کچی سی

اتفاق کی بات ہے۔ کہ ہیں۔ جناب بیدی کی شہرۂ آفاق تصنیف "ایک چادر میلی سی" میں بل کھاتی، دھول اَٹی، اس کچی سی سڑک کا رہنے والا ہوں (اب تھا کہیئے)۔ مگر ابھی تک وہ ذہن میں وقت کی دھول تلے دب جانے کے باوجود، وہ یاد، اب بھی بل کھاتی لہراتی باقی ہے۔ وہ سڑک جس پہ تلوکا، اپنا تانگہ چلایا کرتا تھا۔ جہان کے گاؤں سے۔ ایک طرف ڈسکہ اور دوسری جانب پسرور جایا کرتی۔ دونوں قصبے ضلع سیالکوٹ کی مشہور تحصیلیں تھیں۔ اور اس ٹوٹی پھوٹی سڑک پر تقریباً عین درمیان میں جناب راجندر سنگھ بیدی کا مردم خیز نہ سہی، سحر انگیز آبائی گاؤں کوٹلہ باوا فقیر چند واقع تھا۔ جس کے سادہ، معصوم اور ابن آدم اور بی حوا کی بنیادی خوبیوں، خامیوں سے لبریز ایک آدھ ہزار نفوس پر مشتمل آبادی کے بیشتر مرد و زن اس میلی سی چادر کے سائے تلے الفاظ میں سمٹے سموئے ہوئے ہیں۔ یہ ناولٹ جس نے قارئین کو چونکا کے رکھ دیا۔ میرا اس کے کرداروں سے دوہرا رشتہ تھا۔ میرے لئے وہ فقط صفحوں پر پھیلے ہوئے مصنف کی قلم سے تراشے ہوئے خیالی پروانے بنائے سجائے ہوئے شوالہ میں دعائیں مانگنے والے پجاریوں کے چنگل میں گرفتار پرشاد لینے یا دان دینے والے سادہ لوح عقیدت مند یا پنجاب کی روایت میں رچے پچے قتل ہونے یا قتل کرنے والے روز روشن میں۔ نیچی نظر یا رات کے اندھیرے میں دردانہ وار عورت کے جسم کو دو مختلف نظریوں سے دیکھنے والے لوہے کے لنگوٹے والے۔ یا سواریوں کے انتظار میں بے تاب سڑکوں سے نظر آنے والے افق کے اس پار دھبوں کو مسافر سمجھنے والے تانگہ بانوں، تھکے ہارے کسانوں یا چرب زبان دوکانداروں، چڑھتی جوانیوں یا ڈھلتی ممتا کی وہ داستان نہ تھی، جو اندرونی ماں اور بیرونی بیوی دونوں کو وقت کے ساتھ ساتھ۔ ماحول سے ٹکر لینے کے لئے، خود کو حالات میں بدل لیتی ہے۔ بلکہ یہ انسانی نفسیات کی وہ پیچ در پیچ الجھن تھی، جسے بیدی نے اپنے طور پر سلجھانے کی کوشش کی۔ اور اس کے علاوہ اس کا حل بھی کیا تھا۔ مگر میں نے اسے قطعی ایک اور زاویہ سے دیکھا اس کی وجہ تھی کہ میں بھی برسوں اس سڑک پر کھیلا، ان تانگوں کی سواری کی۔ اس کچی سی سڑک پر

جسمانی طور پر دھچکے محسوس کئے۔ تانگے والوں کی گھوڑے، گھوڑیوں کو ٹھیٹھ پنجابی گالیوں سے نوازتے سنا، مندر کے پجاریوں کو بھگتوں کو اس شوالہ میں مقیم مورتی کے معجزات سناتے اور مرعوب کرتے دیکھا، اور پھر اس گاؤں کے کسانوں کو اپنے آبائی قصبے پسرور کے ایک بیچ در بیچ بازار میں دوکانداروں کی لچھے دار باتوں میں الجھتے دیکھا۔ تو لامحالہ طور پر میں بھی اس میلی سی چادر کی ایک اوٹ میں کھڑا اس کا حصہ بن گیا۔ یہ تو جملہ معترضہ ہی، لیکن حقیقت پر مبنی۔ بیدی صاحب کے آبائی گاؤں، جس میں اس ناولٹ کے کرداروں نے جنم لیا۔ اسے میں مردم خیز کہنے سے ضرور ہچکچایا تھا۔ لیکن خود ضلع سیالکوٹ، مردم خیز دانشوروں کے لئے مشہور تھا۔ اپنے وقت میں اس علاقے میں ایک ہی ڈگری کالج تھا۔ نام تھا مرے کالج سیالکوٹ۔ اس کے اساتذہ میں، جو کبھی ان عمارتوں میں چند برس پڑھا کے اسے منور کر گئے۔ ان میں سوامی رام تیرتھ اور شمس العلما مولوی میر حسن صاحب تھے۔ اور طلبا میں ڈاکٹر سر محمد اقبال، سر ظفراللہ خاں، سر شہاب الدین، سدرشن، اردو اور ہندی کے مشہور افسانہ نگار۔ گور بخش سنگھ جنھوں نے بعد ازاں پنجابی ادب میں نئی راہیں کھولیں۔ اور برسوں تک اردو میں "پریت لڑی" چلاتے رہے۔ جس کے مدیر کسی زمانے میں ساحر لدھیانوی بھی تھے۔ فیض احمد فیض، اور راجندر سنگھ بیدی۔ اور حال کے ادیبوں میں مشہور افسانہ نگار جوگندر پال اور شاعر کرشن موہن سبھی اسی کالج کی پیداوار ہیں۔ گو میں وہاں پر آج سے چالیس برس پہلے پڑھتا تھا۔ لیکن آج بھی لاشعور میں اس میں بیتے ہوئے دنوں کی یاد باقی ہے۔ فلمی دنیا کے پرانے ہیرو۔ شیام چڈھا۔ سلور جوبلی ہیرو راجندر کمار۔ ویلین پریم چوپڑہ۔ اور پروڈیوسر او۔ پی۔ رلہن بھی سب سیالکوٹ کے ہیں۔ لیکن ذکر تو راجندر سنگھ بیدی صاحب کا تھا۔ یہ فہرست تو میں نے اس لئے پیش کی۔ کہ وہ بھی قافلہ سالاروں کی اس سرزمین سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے اردو زبان کی آبیاری کے لئے، جو کچھ بھی ان لوگوں سے بن پڑا، وہ کیا۔ اور ان کی شہرت کی سرحدیں سیالکوٹ کے نقطے سے شروع ہو کے تمام دنیا کو اپنے دائروں میں محیط کئے تھیں۔ اور ادب چوں کہ اس خطہ کی گھٹی میں تھا۔ اور بلا امتیاز مذہب و ملت، اگر ڈاکٹر اقبال مسلمان تھے۔ تو سدرشن ہندو۔ راجندر سنگھ بیدی سکھ تو اثر صہبائی عیسائی۔ مگر ان دنوں بنیادی مسئلہ اردو اور ادب تھا۔ ذات پات کی قید نہ تھی۔ اس ضمن میں مجھے راجندر سنگھ بیدی سے متعلق ایک لطیفہ یاد آگیا۔ میں ان سے پہلی دفعہ کھل کے ان کی بمبئی کی رہائش گاہ واقع تزد خالصہ کالج بمبئی پر ملا۔ میں ان دنوں ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنس میں مجرم بچوں کی نفسیاتی الجھنوں پر تحقیق کر رہا تھا۔ وہاں ان سے میری ملاقات ہوئی۔ ان سے میری ملاقات جناب بلراج ساہنی مرحوم نے کرائی۔ اور جب انھیں پتہ چلا کہ میں بھی سیالکوٹ کا ہوں

نہ معلوم مٹی کا اثر تھا، یا غریب الوطنی کی ملاقات۔ مجھے گلے سے لگا کر کہنے لگے۔ ارے بھائی۔ تمھیں کہیں فلمیر یا تو نہیں ہو گیا۔ جب میں نے انکار میں سر ہلایا۔ تو ایک آہ بھر کے کہا "شکر ہے۔ ورنہ اس شوق نے مجھے نہ گھر کا رکھا نہ گھاٹ کا۔ خالصہ کالج والوں نے مجھے سکھ ماننے سے انکار کر دیا ہے"۔ تو میں حیرانگی سے ان کے منہ کو بٹ بٹ تکنے لگا۔ تو ساہنی صاحب نے مجھے بتلایا کہ خالصہ کالج والوں نے بیدی کے لڑکے نریندر کو کالج سے نکال دیا ہے۔ لیکن اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس میں بھی بھلائی تھی کیوں کہ شاید اگر نریندر حسب معمول پڑھتا رہتا۔ تو شاید وہ مشہور فلم ڈائرکٹر نریندر بیدی نہ بن سکتا۔

میں نے سب سے پہلے بیدی صاحب کو کب پڑھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں۔ شاید ان کا افسانہ "لاجونتی" میں نے سن چالیس کی دہائی میں کبھی پڑھا تھا۔ کیوں کہ ان دنوں نئی نسل کے ذہنوں پر ترقی پسند ادبا نے دھاوا بول رکھا تھا۔ اور جناب بیدی ان مصنفین کے قافلہ سالاروں میں تھے۔ اور لامحالہ ان سے ذہنی طور پر مرعوب ہونا ایک لازمی سا امر تھا۔ اور میں نے ذہن میں ان کا ایک نہایت عالمانہ، فاضلانا قسم کا، نہایت بھاری بھر کم قسم کے، مخنی داڑھی اور بھاری عمامے والا خاکہ مرتب کر لیا تھا۔ لیکن مجھے شاید ان سے ملنے کا اتفاق لاہور میں ۱۹۴۳ء میں بسنت روڈ پر سنگم پبلشر کے ہاں ہوا۔ اب صاحب، نہ تو ان کی باتیں حکیمانہ اور فلسفیانہ بلکہ ٹھیٹھ پنجابی میں، ایک سیدھے سادے متوسط طبقے کے ایک عام فرد جیسی تھیں۔ داڑھی وہ ضرور رکھے ہوئے تھے، اگر نہ ہی مخنی چوڑی اور گھنی۔ بس داڑھی تھی۔ اور یہی حال پگڑی کا تھا۔ ایک ململ کا صافہ جس سے ان کا سر ڈھانپا ہوا تھا میرے ذہن نے بے ساختہ سوچا۔ تو یہ ہیں بیدی صاحب۔ دانہ و دام۔ گرہن اور دیگر افسانوں کے مشہور مصنف۔ اور جب میں نے انھیں عام آدمی کے روپ میں دیکھا، تو احساس کمتری جو مجھ پر طاری تھا، وہ خود بخود ختم ہو گیا۔ اور اس کی جگہ ایک عجب قسم کی عقیدت نے لے لی، جو اب تک قایم ہے۔

بیدی صاحب پر ایک الزام اور لگایا جاتا ہے۔ کہ وہ "پنجابی اردو" لکھتے ہیں ہوگا۔ لیکن خاص خاص اہل زبان کی نظر میں۔ لیکن جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں وہ اتنی سادہ اور عام فہم زبان میں ہوتی ہے کہ نظروں کے دروازوں سے وہ ذہن میں گھس جاتی ہے۔ اور وہاں سے وہ روح میں گھل مل کر ہلچل مچا دیتی ہے۔ ایک دفعہ کسی نے بیدی صاحب سے کہا کہ فلاں صاحب وہ مشہور افسانہ نگار۔ جناب زبان نہیں لکھتے بلکہ ان کے الفاظ تو پھولوں کے گلدستے ہوتے ہیں تو بیدی صاحب

نے ہنس کے کہا "میں مانتا ہوں صاحب۔ وہ افسانہ نگار کم۔ اور مالی یا پھولوں کے بیوپاری زیادہ ہیں ان کو کہیئے بہاروں کی زبان میں نہیں بلکہ کہانی کی زبان میں لکھا کریں"۔ اور یہ حقیقت ہے۔ کہ بیدی صاحب کی افسانہ نگاری کا انداز منفرد ہے۔ اور ان کی نقل کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔

بیدی صاحب کی فلم "دستک" دیکھی۔ یہ ان کے اپنے ایک پرانے ریڈیائی یا دوسرے ڈرامے کا جو شایع ہو کے بازار میں آچکا تھا، اس کا فلمی تجربہ تھا۔ لیکن خوب۔ اور اس فلم کی وساطت سے بیدی صاحب نے ماں لکشمی کے دروازے پر دستک دی۔ ماں نے تھوڑا سا دروازہ کھول کے جھانکا۔ اور بیدی صاحب کے ہاں ریل پیل ہوگئی۔ لیکن ادیب تھے۔ سمجھے ماں مہربان ہوگئی۔ اور ان کے ذہن میں غنچے چٹکنے لگے۔ جنھوں نے بالآخر "پھاگن" کی شکل اختیار کرلی۔ لیکن ماں لکشمی دردن عرصہ اپنی پہلی غلطی پر تائب ہو کے پھر سے اپنا دروازہ مضبوطی سے بند کرچکی تھیں۔ بلکہ شاید اندر سے تالہ لگا کے چابی گم کر بیٹھی تھیں۔ کیوں کہ بیدی صاحب۔ لاکھ دروازہ پیٹتے رہے۔ چیخ چیخ کے الکھ نرنجن جگاتے رہے کہتے رہے کہ دیکھو میں تمھارے لئے کتنے خوبصورت پھول چن چن کے لایا ہوں۔ لیکن لا حاصل۔ بےسود۔ اور بیدی صاحب کا ذہن اور صحن دونوں پھاگن کے زرد پتوں سے اٹ گیا۔ اب شاید بیدی صاحب تائب ہیں۔ پشیمان ہیں۔ لیکن چہ اکارے کند عاقل۔

میں نے حال میں ہی پچھلے سال بیدی صاحب کو دہلی میں دیکھا۔ جہاں وہ اردو افسانہ نگاروں کے مجمع میں۔ جو ہند و پاک کے دانشوروں کا مرقع تھا، وہاں پر موجود تھے۔ لیکن مجھ میں حوصلہ نہ پڑا کہ میں بڑھ کے ان کے وہ ہاتھ پھر اپنے ہاتھ میں لے لوں، جن کی مٹی میرے اپنے وطن کی ہے۔ میں ان کی نظروں سے نظریں نہ ملا سکا۔ کیوں کہ زمانہ کی کس مپرسی نے ان سے پہچان کی قوت چھین لی ہے۔ وہ داڑھی، جو کبھی میں نے لاہور میں کالی سیاہ چمکدار، بمبئی میں کھچڑی نما۔ دہلی لیکن بارعب دیکھی تھی اب وقت کے تقاضے سے بالکل سفید تھی۔ لیکن جس میں مایوسی چھپی ہوئی اور ناامیدی کی جھلک تھی۔ وہ رنگ دار، پیچ در پیچ بندھا ہوا، کسا ہوا پنجابی صافہ اب ایک ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں بدل چکا تھا۔ اور پھر ان کو دیکھ کے میرا ذہن بے ساختہ کہہ اٹھا۔ کہ یہ جسم راجندر سنگھ بیدی کا ہے۔ کہ یہ شخص یقیناً راجندر سنگھ بیدی نہیں ہے۔ اور یہ میرا ہی نظریہ نہیں ہے۔ ان کے لاکھوں چاہنے والوں، پڑھنے والوں، اور ان کے خوبصورت افسانوں پر سر دھننے والوں کا ہے۔ جو اب اس انتظار میں ہیں کہ کب ہم اپنے اپنے رسالوں کے "بیدی نمبر" نکالیں۔ ان کی یاد میں جلسے کریں۔ جلوس میں شرکت کریں۔ ان کو خراج عقیدت پیش کریں ان کی یادگار قایم کریں۔ لیکن جب تک وہ زندہ ہیں: ہم ان کا ہاتھ تھامیں گے نہ ان سے نظریں ملائیں گے۔ □

ضیاء الدین انصاری
مولانا آزاد لائبریری
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

راجندر سنگھ بیدی کی تصانیف

۱۔ سات کھیل (ڈرامے) لاہور۔ ادبی سنگم، ۱۹۴۶ء، ۲۴۳ ص

مندرجات: (۱) خواجہ سرا ص ۹-۴۴ (۲) جانکیہ ص ۴۵-۷۲ (۳) تلچھٹ ص ۷۳-۱۱۴ (۴) نقلِ مکانی ص ۱۱۵-۱۵۴ (۵) آج ص ۱۵۵-۱۹۰ (۶) رخشندہ ص ۱۹۱-۲۲۰ (۷) پاؤں کی موچ ص ۲۲۱-۲۴۳۔

۲۔ کوکھ جلی (افسانے) بمبئی۔ میٹرو پریس، ۱۹۴۹ء، ۲۲۱ ص

مندرجات: (۱) لمس ص ۹-۱۹ (۲) کوکھ جلی ص ۲۰-۳۷ (۳) بیکار خدا ص ۳۸-۵۷ (۴) نامراد ص ۵۸-۷۳ (۵) مہاجرین ص ۷۴-۹۵ (۶) کشمکش ص ۹۶-۱۱۷ (۷) ایک عورت ص ۱۱۸-۱۲۶ (۸) ٹرمینس ص ۱۲۷-۱۴۸ (۹) گالی ص ۱۴۹-۱۶۱ (۱۰) خطِ مستقیم اور قوسین ص ۱۶۲-۲۰۰ (۱۱) آگ ص ۲۰۱-۲۲۱۔

۳۔ ایک چادر میلی سی (ناولٹ)۔ نئی دہلی۔ مکتبہ جامعہ ۱۹۶۲ء ۱۳۶ ص

دوسری بار ۱۹۷۵ء میں مکتبہ جامعہ سے شایع ہوئی۔

۴۔ اپنے دکھ مجھے دے دو (افسانے)۔ نئی دہلی۔ مکتبہ جامعہ۔ ۱۹۶۵ء۔ ۲۶۰ ص

دوسری بار ۱۹۷۵ء میں مکتبہ جامعہ سے شایع ہوئی۔

مندرجات: (۱) لاجونتی ص ۹-۲۴ (۲) جوگیا ص ۲۵-۴۶ (۳) بُبل ص ۴۷-۸۴ (۴) لمبی لڑکی ص ۸۵-۱۲۰ (۵) اپنے دکھ مجھے دے دو ص ۱۲۱-۱۵۶ (۶) ٹرمینس سے پرے ص ۱۵۷-۱۸۶ (۷) حجام الہ آباد کے ص ۱۸۷-۲۱۲ (۸) دیوالہ ص ۲۱۳-۲۳۸ (۹) یوکلپٹس ص ۲۳۹-۲۶۰۔

۵۔ دانہ و دام (افسانے) نئی دہلی۔ مکتبہ جامعہ۔ ۱۹۶۳ء۔ ۲۲۴ ص

مندرجات: (۱) بھولا ص ۹-۲۴ (۲) ہمدوش ص ۲۵-۳۶ (۳) من کی من میں ص ۳۷-۵۳ (۴) گرم کوٹ ص ۵۴-۶۹ (۵) چھوکری کی لوٹ ص ۷۰-۸۶ (۶) پان شاپ ص ۸۷-۱۰۲ (۷) منگل اشٹکا ص ۱۰۳-۱۱۹ (۸) کوارنٹین ص ۱۲۵-۱۳۶ (۹) تلادان ص ۱۳۷-۱۵۲ (۱۰) دس منٹ بارش ص ۱۵۳-۱۶۵ (۱۱) وٹامن بی ص ۱۶۶-۱۸۰ (۱۲) الجھن ص ۱۸۱-۱۹۵ (۱۳) ردِعمل ص ۱۹۶-۲۱۳ (۱۴) سرت کا راز ص ۲۱۴-۲۲۴

دوسری بار ۱۹۸۰ء میں مکتبہ جامعہ سے شایع ہوئی۔

۶۔ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے (افسانے) نئی دہلی۔ مکتبہ جامعہ ۷۴ ۱۹ء۔ ۲۴۰ ص
مندرجات: (۱) ہاتھ ہمارے قلم ہوئے ص ۷۔ ۲۵ (۲) صرف ایک سگریٹ ص ۳۶۔ ۴۷
(۳) کلیانی ص ۷۵۔ ۹۰ (۴) منتھی ص ۹۱۔ ۱۰۹ (۵) باری کا بخار ص ۱۱۰۔ ۱۴۰ (۶) سوفیا ص ۱۴۱۔ ۱۶۳
(۷) وہ بڈھا ص ۱۶۴۔ ۱۸۷ (۸) جنازہ کہاں ہے ص ۱۸۸۔ ۲۰۶ (۹) تعطل ص ۲۰۷۔ ۲۲۶ (۱۰) آئینے کے
سامنے ص ۲۲۷۔ ۲۴۰ ☐